88/3

قد افلح من تزكى وذكر اسم ربه فصلى (القرآن الحکیم)

وہ فلاح پا گیا جس نے تزکیہ کر لیا اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا پھر نماز کا پابند ہو گیا

المجاهد من جاهد نفسه (حدیث شریف)

مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے خلاف جہاد کرے

ماہنامہ المرشد چکوال

بیادِ

شیخ العرب والعجم صدیق دوراں مجدد طریقت مجتہد فی التصوف بحر علوم شریعت

امام اولیاء شیخ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ حضرت العلام مولانا قلزم فیوض برکات

اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ

دار العرفان منارہ ضلع چکوال

المرشد

دارالعرفان - منارہ، ضلع چکوال

جلد ۹ | رجب المرجب ۱۴۰۶ھ ہجری - مارچ ۱۹۸۶ء | شمارہ ۷

اس شمارہ میں

- ادا ریہ ــــــ ۲
- باتیں اُن کی خوشبو خوشبو ــــــ ۶
  (حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ)
- اسرار التنزیل - (حضرت مولانا محمد اکرم) ــــــ ۸
- حرمین شریفین ــــــ ۲۱
  (ارقم انصاری)
- لمحۂ فکریہ (ایک قاریہ) ــــــ ۳۷
- احتیاط (اسیماب اویسی) ــــــ ۴۴
- افہام و تفہیم
  (حضرت مولانا محمد اکرم) ــــــ ۴۷
- عورت کی عظمت ــــــ ۴۹

بیاد

حضرت العلام مولانا

اللہ یار خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

سرپرست

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان مدظلہٗ

مدیرِ مسئول

پروفیسر حافظ عبدالرزاق

(ایم اے اسلامیات، ایم اے عربی)

مدیرانِ اعزازی

ابوطلحہ

ملک عبدالغفار

بدل اشتراک

چندہ سالانہ ــــ ۷۵ روپے

ششماہی ــــ ۴۰ روپے

فی پرچہ ــــ ۷ روپے

سول ایجنٹ

اویسیہ کتب خانہ

الوہاب مارکیٹ - اردو بازار لاہور

خطاطی: سعید احمد، ٹاؤن شپ لاہور

طابع و ناشر: حافظ عبدالرزاق • مطبوعہ: شرکت پرنٹنگ پریس لاہور • مقام اشاعت: دارالعرفان منارہ، ضلع چکوال

اداریہ

ملک میں انتخابات کا عمل شروع ہو چکا ہے اور اب یہ چلتا رہے گا کہ یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ ابھی بنیادی جمہوری ادارے وجود میں آئے پھر سینٹ کا انتخاب آ رہا ہے۔ جب اس کی رونقیں ماند پڑنے کو ہوں گی تو اسمبلیوں کے انتخابات کی آمد آمد گرما گرمی پیدا کر دے گی۔ اس تمام تر کوشش کا سہرا موجودہ حکومت کے سر ہے اور یہ حکومت اور اس کا وجود ہمیں مارشل لاء نے دیا تھا۔ سو خوبیٔ قسمت کہ مارشل لاء سے جمہوریت نصیب ہوئی جو مسلسل پنپ رہی ہے یہ اور بات ہے کہ چند ناخوشگوار باتیں بھی دیکھنا اور بھگتنا پڑیں۔ مگر ایک بات طے ہے کہ تمام انتخابات آزادانہ ہوئے اور ہمیشہ شریف لوگ چُنے گئے۔ اس بات سے اختلاف کرنا تو سراسر زیادتی ہے۔ ہاں ایک بات ہے کہ اہلِ وطن کے پیمانہ ہائے شرافت ذرا مختلف ہیں۔ اس لیے لوگوں کی کوالٹی میں تھوڑا فرق آ جائے تو کوئی عجیب بات نہیں۔ اور معیارِ شرافت کا فرق کچھ اس طرح سے ہے کہ پہلے زمانے میں لوگ شعائر اللہ کے ساتھ لفظ شریف بڑھا دیتے تھے۔ جیسے مکہ شریف، مدینہ شریف یا پھر اللہ کے ذاتی کلام کو قرآن شریف کہہ دیتے اور یا عبادات کو جیسے رمضان شریف۔ کچھ لوگ اب تک اس بات پر ہی قائم ہیں مگر کچھ لوگ آگے بڑھ گئے۔ اور یوں محرم شریف گیارہویں شریف اور عرس شریف کا خوبصورت اضافہ معیارِ شرافت کو ایک نیا رُخ عطا کر گیا۔ اور آپ خوب جانتے ہیں کہ محرم شریف کے ساتھ کتنی شرافتوں کا اضافہ ہُوا اور گیارہویں شریف نے کس قدر ترقی کی۔ وہ اپنے جلو میں علم شریف۔ دُلدل شریف لایا تو اِدھر میلاد شریف اور پھر مزید ترقی جشنِ میلاد شریف لائی اور عرس شریف نے نہ صرف تقریباتِ عرس کو بلکہ ہر اس شہر۔ قریئے اور

گاؤں کو بھی شریف کہہ دیا جہاں عرس شریف ہوتا ہو۔ ہم خود جس چھوٹے سے گاؤں میں رہتے ہیں یہ بھی منارہ شریف ہے اور اس کی شرافت ہماری بخشی ہوئی نہیں بلکہ ہم سے پہلے ایک بزرگ تھے جن کا اب عرس شریف ہوتا ہے جس کے ساتھ گزشتہ چند سالوں سے گیارہویں شریف نے بھی شراکت کر لی ہے۔ یہ سب ان کی نوازشاتِ خسروانہ ہیں اور ہم ان کے ممنونِ احسان ہیں۔ خیر شرافت نے جس قدر ترقی کی یہ اپنے ہر موڑ پر کچھ لوگوں کو اپنے پیچھے چھوڑتی چلی آئی۔ اور کچھ ایسے جواں ہمت ساتھ لیتی آئی جنہوں نے اسے پھر سے نئی منزلوں کی طرف گامزن کر دیا۔ حتیٰ کہ عرس شریف کے پردے میں قوالی شریف نے سر اُبھارا اور محرم شریف کے پردے میں قصیدہ و مرثیہ شریف میدان میں آئے — یہاں بالکل ایک نئی قوم بابِ شرافت میں داخل ہوگئی جن کا کام محض گانا بجانا اور نام حسبِ حال مختلف تھے۔ مگر تھے سارے ہی شرافت سے بیگانہ یہ لوگ اپنی سوچ اور اپنے کردار کے اعتبار سے تو وہی رہے مگر شریف کے زمرے میں آنا جانا ان کو بھی نصیب ہوا اور اب دونوں کے حسنِ تعاون یا ملاپ شریف سے شرافت کے معیار نے ایک منزل اور مار لی کہ یکا یک اخبار، ریڈیو ٹیلی ویژن اور فلم سے ایک گونج اُٹھی بابرہ شریف — سُنا تو حیرت ہوئی کہ یہ نام ہی نیا لگا نہ شعائر میں نظر آیا نہ حرمت والے مہینوں میں نہ گیارہویں کی قطار میں نہ عرس کے ہنگاموں میں تو ناچار پوچھنا پڑا — اپنا ذہن تو آگرہ کی طرف منتقل ہوا کہ یہ بھی کوئی شہرِ خوباں ہوگا مگر ایسا نہ تھا۔ تو پھر کیا تھا؟ ہر چند سوال کرنا پسند نہیں تھا کہ لوگ کہیں گے اتنا بھی نہیں جانتے مگر جب واقعی نہیں جانتے تو پھر پوچھے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ پتہ چلا موصوف ایک اداکارہ ہیں — اور اب آپ ملاحظہ فرمائیے کہ کیا کیا شریف ہے اور کتنے لوگوں کا معیارِ شرافت کیا ہے۔ سو اس وجہ سے اگر لوگ مختلف مکتبہ ہائے فکر سے بھی چُنے گئے ہوں تو فکر کی بات نہیں وہ ضرور کسی نہ کسی انداز میں شریف ہوں گے اور یہی سب سے اچھی بات ہے کہ تمام قومی اور ملکی اداروں میں شریف لوگ چُنے جائیں۔ جہاں تک انتخابات کے انعقاد کا تعلق ہے، تو وہاں بھی دامنِ شرافت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ پہلے

حکومتیں جھوٹے مقدمے بنا دیتی تھیں۔ حتیٰ کہ امیدواروں کو اغوا تک کر لیا جاتا تھا مگر اب کے ایسا نہیں ہوا بلکہ جہاں کوئی شخص ناپسندیدہ دکھائی دیا وہاں نہایت شرافت سے اس کے حلقۂ انتخاب میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی گئی۔ صرف اتنی کہ جن لوگوں سے اسے ووٹ ملنے کی توقع تھی۔ وہ کسی دوسرے امیدوار کے حلقے میں چلے گئے اور اس کے حصّے میں ایسے لوگ آئے جنہوں نے اس کی ایک نہ سُنی۔ حکومت نے اسے تقریریں کرنے سے منع کیا اور نہ اشتہار چھپوانے اور لگانے سے کوئی پکڑ دھکڑ ہوئی۔ کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ بس سارا کام نہایت شرافت سے ہو گیا۔

دیہات میں ایک معیارِ شرافت دوسرے انداز کا بھی ہے کہ جب لوگ جرائم کرتے ہیں تو چوکی تھانہ میں ان کی مدد کو کون پہنچے گا اور ان کے جرائم کی سزا سے ان کو بچانے کے لیے کسی شریف افسر کی کچھ خدمت ہو جائے گی اور معاملہ ختم۔ ایسے لوگ سب سے زیادہ شریف سمجھے جاتے ہیں۔ یقیناً شرافت کی یہ نادر قسم بھی ضرور سرکاری دربار تک پہنچے گی تو اس میں فکر کی بات نہیں بات اختلافِ معیار کی ہے۔

اب سینیٹ کا انتخاب متوقع ہے جس میں امید یہی ہے کہ شرافت ہی سے سب کچھ کیا جائے گا۔ اور شریف لوگ ہی اس شریف زین ادارے کے لیے چُنے جائیں گے جہاں تک آزادیٔ انتخاب کا تعلق ہے وہ بھی بے نظیر تھی کہ ایسی آزادی اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئی سبحان اللہ پولنگ سٹیشنوں پر سکولوں سے اساتذہ مقرر تھے اور وہ بھی نہایت شریف جنہوں نے کسی کو تنگ نہیں کیا۔ اور ایک آدھ پولیس کا سپاہی جس کی شرافت کا اندازہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ گیٹ سے باہر جا کر آرام سے بیٹھا سگریٹوں کے دھوئیں سے مرغولے بناتا رہا اور یوں سب آزادی سے ووٹ پول کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ برسوں پہلے مر چکے تھے ان کے ووٹ بھی ان کے ورثاء نے ان کی طرف سے پول کر دیئے اور یوں شرافت اور آزادی کا ثواب اُن کی قبر تک پہنچا۔ اس سے زیادہ کا تصوّر یا مطالبہ تو مناسب نظر نہیں آتا مگر جو لوگ

مطمئن نہیں وہ بھی بڑے شریف لوگ ہیں اور ہم بجز دعا کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں — سو اپنی تو دعا ہے کہ اللہ مسلمانوں کے اس ملک کو ابد الآباد قائم رکھ اور اس کے بسنے والوں کو اپنی اطاعت و محبت عطا کر۔

اللہ قبول فرمانے والا ہے اور اس کے کرم سے کچھ بعید نہیں کہ ہمارے معیارِ شرافت میں بھی یک رنگی بخش دے۔ سب کا ایک ہی معیار ہو۔ وہ معیار جو آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ معیار ہے۔ آمین!

فقیر محمد اکرم

سہ روزہ اجتماع منارہ / مرشد آباد

آمد احباب دارالعرفان۔ بروز منگل شام تک — ۲۹-۳-۸۸

روانگی احباب برائے مرشد آباد بروز جمعرات بعد از نماز ظہر — ۳۱-۳-۸۸

واپسی دارالعرفان بعد از نمازِ فجر۔ جمعۃ المبارک ۱-۴-۸۸

اختتام سہ روزہ اجتماع بعد از نماز جمعۃ المبارک — 〃

باتیں اُن کی خوشبو خوشبو

(حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ)

فرمایا: ذکرِ الٰہی تمام عبادات سے افضل ہے۔ قرآن کریم میں ذکرِ الٰہی کے صلہ میں ایک ایسی نعمت کا وعدہ دیا گیا ہے جس سے بڑی نعمت مومن کے لیے اور کوئی نہیں۔ قال اللہ تعالیٰ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ، یہ وعدہ صرف ذکرِ الٰہی کے ساتھ مختص ہے اور ظاہر ہے جسے اللہ تعالیٰ یاد کرے اس سے زیادہ خوش نصیب کون ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا کہ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ، واقعی اگر ذکرِ الٰہی سب سے بڑی نعمت نہ ہوتی تو اس کے صلے میں اذکرکم کی نعمت غیر مترقبہ کیوں کر مل سکتی تھی۔

فرمایا: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔

عن عائشۃ رض قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ

(رواۃ المسلم)

"حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔"

فائدہ۔ لفظ "احیان" جمع ہے اور قاعدہ ہے کہ اضافت جمع کی اپنے مابعد کی طرف استغراقِ حقیقی کا فائدہ دیتی ہے۔ پھر اس پر محیط الافراد لفظ "کل" بھی داخل ہے۔ لہٰذا تمام اوقات میں بول و براز۔ جماع، اکل و شرب، نیند اور دوسرے مشاغل بھی شامل ہیں۔

کما قال اللہ تعالیٰ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا۔ کلِ احیان میں مراد ذکرِ قلبی ہی ہو سکتا ہے اور استغراقِ حقیقی کی وجہ سے اپنے اوقات میں ذکرِ لسانی کو بھی شامل ہوگا۔ خیال رہے یہاں استغراقِ عرفی یا

اضافی نہیں کیونکہ قرینہ مخاطبہ الجنب موجود ہے۔ چونکہ ایسی حالت میں ذکر لسانی ناجائز ہے، اس لیے لازماً ذکرِ قلبی مراد ہوگا۔" کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا میں تمہیں ایسا عمل نہ بتاؤں جو سب سے افضل ہو۔ جس کا ثواب اللہ کے ہاں سب سے زیادہ ہو۔ جو تمہارا درجہ سب سے بلند کردے اور وہ عمل کرنا سونا چاندی خرچ کرنے سے بھی زیادہ پسندیدہ ہو اور جو دشمنوں کے خلاف جنگ کرنے اور انہیں قتل کرنے سے بھی افضل ہو۔ صحابہ کرام رضؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ ضرور فرمایئے ــــ فرمایا "اللہ کا ذکر سب سے افضل ہے۔"

فرمایا۔ ذکرِ الٰہی مومن کے لیے ایک قلعہ ہے۔

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اللہ کو کثرت سے یاد کیا کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ آدمی کے تعاقب میں دشمن تیزی سے آرہا ہو اور وہ آدمی اس سے بچنے کے لیے قلعہ میں پناہ گزین ہوجائے۔ اس طرح شیطان سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ صرف اللہ کا ذکر ہے۔"

فرمایا: ذکرِ الٰہی سے غفلت شیطان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے مترادف ہے۔

قال تعالیٰ "جو شخص ذکرِ الٰہی سے آنکھ چرالے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کردیتے ہیں۔ وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔" (الزخرف)

"اُن پر شیطان نے پورا تسلط کرلیا ہے سو اس نے ان کو خدا کی یاد بھلادی۔ یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں۔" (المجادلہ)

ان دونوں آیتوں سے واضح ہوگیا کہ اللہ کی یاد سے غافل ہونا شیطان سے تعلقات استوار کرنا ہے اور اللہ سے تعلق توڑنا اور شیطان سے رشتہ جوڑنا ہے۔ جو ذکر سے غافل ہوا حزب اللہ سے نکل گیا اور حزب الشیطان میں داخل ہوگیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

ضلع اٹک کے امیر حلقہ جناب پروفیسر علی صفدر صاحب کے بڑے صاحبزادے وقار علی ۳ر جنوری ۸۸ء کو سندھ جاتے ہوئے سکھر کے قریب ایک حادثے میں جاں بحق ہوگئے۔

تمام احباب سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اسرارُ التنزیل

— حضرت مولانا محمد اکرم مدظلہ العالی —

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ ھٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَبَیْنِکَ ۚ سَاُنَبِّئُکَ بِتَاْوِیْلِ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ذٰلِکَ تَاْوِیْلُ مَالَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْہِ صَبْرًا ؕ

(سورہ کہف : ۷۸/۸۲)

قرآنِ کریم نے ان آیاتِ مبارکہ میں حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات اور اُن کو آنے والے واقعات کو تفصیلاً ارشاد فرمایا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک کا موضوع ہمیشہ سے ترہیب و ترغیب ہی ہے۔ یعنی گناہ سے روکنا اور نیکی کی دعوت دینا۔

واقعات تاریخی کو بھی جہاں قرآن کریم لیتا ہے اسی مقصد کے لیے اور اسی اصول کے تحت لیتا ہے تاریخ بیان کرنا قرآن کا اسلوب نہیں۔ اسی لیے حضرت موسےٰ علیہ السلام کے ذکر کو لے لیجئے۔ اُس کے متعدد ٹکڑے متعدد آیات میں مختلف جگہوں پر ملتے ہیں جو ٹکڑا جہاں مناسب جانا ارشاد فرمایا۔

یہ ملاقات بڑی انوکھی بڑی نرالی بڑی عجیب ہے۔ حضرت موسےٰ علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام اولوالعزم رسول ہیں نبی رسول اور اُولوالعزم ان کے اسی ترتیب سے مراتب ہیں۔ رسُول انہیں کہا گیا ہے جو اپنی کتاب اور اپنی شریعت لے کر مبعوث ہوئے۔ صرف نبی جن ہستیوں کو کہا گیا ہے انہوں نے کسی رسول کی شریعت کو آگے چلایا اور اولوالعزم رسول یہ صرف پانچ ہستیاں ہیں۔ اتنی بہت بڑی مقدس

جماعت ہے انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ۔ اِس میں صرف پانچ ہستیاں ہیں یعنی جتنے انسان دنیا پر پیدا ہوئے ، اِس پوری انسانیت میں یہ پانچ ہستیاں سب سے مقدّس ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام ـ حضرت نوح علیہ السلام ، حضرت ابراہیم علیہ السلام ، حضرت موسےٰ علیہ السلام حضرت عیسےٰ علیہ السلام اور یہ پانچوں بھی پھر تابع ہیں محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ۔ اور کائنات میں صرف ایک ہستی آقائے نامدار صلّی اللہ علیہ وسلّم ہیں ۔ ان پانچ میں سے ایک ہیں موسیٰ علیہ السلام ۔ حضرت خضر علیہ السلام بنی اسرائیل میں ایک ولی اللہ گزرے ہیں ۔

اور ولایت کا درجہ نبوّت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا ۔ نبی کو دیکھنے والا نبی سے ملاقات کرنے والا صحابی بن جاتا ہے ـــ اور ساری دنیا کے ولی اکٹھے کیے جائیں تو صحابی کی خاک کو نہیں پا سکتے ۔ نبی کی صحبت میں پہنچنے والا ولی کی رسائی سے بہت آگے چلا جاتا ہے تو پھر نبی کے مقابلے میں ولی کی کوئی حیثیت نہ رہی ۔ یہاں معاملہ جو ملتا ہے وہ یوں ملتا ہے حضرت خضر علیہ السلام ، واقعات کو دیکھ کر ، بیان کو دیکھ کر ، یوں سمجھ آتی ہے جیسے موسےٰ علیہ السلام کے مقابلے میں خضر علیہ السلام بڑھ کر ہیں بازیادہ جانتے ہیں ۔ خداوند کریم نے موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر کی ملاقات کا حکم دیا ۔ جب آپ وہاں تشریف لے گئے ۔

عجیب واقعہ ملاقات کا ملتا ہے آپ کے ساتھ آپ کا غلام تھا ۔ اُسے ایک تلی ہوئی مچھلی دی موسےٰ علیہ السلام نے فَلَمَّا بَلَغَا . . . . نَسِيَا حُوتَهُمَا جہاں دو سمندر ملتے ہیں ۔ کوئی خلیج کا علاقہ ہوگا ـــ تو وہاں مچھلی بھول گئے وہ آگے نکل گئے ۔ موسےٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ بھئی وہ مچھلی جو مَیں نے دی تھی ۔ وہ کہاں ہے ، تب انہوں نے عرض کیا کہ جب ہم وہاں کسی چٹان پہ ٹھہرے تھے ۔ تھوڑی دیر کے لیے اِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ تو وہاں مَیں بھول گیا تھا اور شیطان نے یہ لغزش مجھے مزید کرائی کہ مَیں آپ کی خدمت میں عرض بھی نہ کر سکا ۔ کہ مَیں مچھلی چھوڑ آیا ہوں یہ لغزش بھی ہے لیکن عجیب ہے ـــ اگرچہ مچھلی تلی ہوئی تھی پکی ہوئی تھی ۔ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا (کہف ۶۳) عجیب بات ہے کہ جیسے مَیں نے چٹان پر رکھی مچھلی پانی میں چلی گئی اور تیرتی ہوئی اپنا راستہ بنا کر پانی میں چلی گئی ـــ تو موسےٰ علیہ السلام نے فرمایا ذَٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ یہ ہی تو

جگہ ہے جسے ہم تلاش کر رہے تھے۔ اللہ کریم نے یہی تو نشانی فرمائی تھی مجھے — تُو نے وہاں کیوں نہیں بتایا فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا — باتیں کرتے کرتے واپس پلٹے۔ اُس مقام پر جب وہاں پہنچے فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا ۔ میرے بندوں میں سے ایک بندے کو وہاں پایا اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً . . . . عِلْمًا ۔ ہم نے اسے اپنی طرف سے بے شمار رحمت عطا فرمائی۔ اور عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ اسے علمِ لدنی کہتے ہیں — انبیاء کا علم جو ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے۔ نبی اور رسول دنیا میں کسی مدرسے سے کسی استاد سے نہیں پڑھتے۔ کسی انسان سے نہیں سیکھتے۔ اللہ کی طرف سے انہیں ایسے علوم عطا فرمائے جاتے ہیں کہ اُن کی رائے ہر موضوع پر ہمیشہ حرفِ آخر ہُوا کرتی ہے۔ اُس سے بڑھ کر صحیح کوئی نہیں ہو سکتا — خود حضور نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو لے لیں — آپ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ مکہ مکرمہ میں جوان ہوئے مکہ مکرمہ میں چالیس برس بسر فرمائے کوئی مدرسہ تھا ہی نہیں کسی پڑھے لکھے آدمی کے ساتھ آپ کا اُٹھنا بیٹھنا نہیں تھا کسی کے پاس جانا نہیں تھا کہیں سے کسی سے کوئی لفظ نہیں سیکھا اور چالیس برس کسی موضوع پر کسی سے کوئی بات نہیں کی — اور جب لب کُشائی کی اور جب فرمایا، میں اللہ کا نبی ہوں اللہ کا رسول ہوں اور اللہ کی طرف سے مجھ پر وحی آتی ہے — تو پھر اس دنیا کے ہر موضوع پہ — اخلاقیات ہوں یا سیاسیات ہوں یا معاشیات — تمام موضوعات پہ جو کچھ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرما دیا آج تک اُس پر کوئی اضافہ نہیں کر سکا۔ اور قیامت تک کوئی کر بھی نہیں سکے گا — یہی حال صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ہے کہ اُن میں بیشتر سوائے چند افراد کے نزول قرآن کے وقت سات کے قریب افراد کے نام ملتے ہیں کہ وہ وحی کی کتابت کرتے تھے جنہیں کچھ لکھنا آتا تھا۔

تو صحابہ کرامؓ کی تعداد لاکھوں تک تھی اور لاکھ دو لاکھ یا ڈھائی لاکھ میں سات آدمی اگر لکھ سکتے ہوں تو پھر یہ کوئی علمی معیار تو نہ ہُوا۔ اس میں پڑھے ہوئے لوگ کتنے ہیں۔ اس کے باوجود حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت یہ تھی کہ ہر صحابی مفسّر بھی ہے محدّث بھی ہے فقیہہ بھی ہے کوئی مسئلہ بھی ہو جہاں صحابہ کی بات آجائے تمام علماء کی گردنیں

جھک جاتی ہیں ۔ پھر دنیوی اعتبار سے آپ دیکھ لیں صحابہ کرام نے ایک جہان کو مسخر کیا اور اتنی بڑی حکومت قائم فرمائی کہ تاریخ میں کوئی دوسری اتنی بڑی حکومت نظر نہیں آتی ۔ پھر اتنی حکومت کا اس خوبی سے انتظام فرمایا کہ دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ کسی پر زیادتی کا تصور نہیں تھا۔ اور یہ سب کچھ اُن لوگوں نے کیا جو صحرائے عرب میں اونٹوں کے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ چھوڑ کر سیدھے بارگاہِ نبوی میں آئے ۔ کوئی مدرسہ کوئی یونیورسٹی کوئی ادارہ کوئی کورس نہیں کیا ۔ کسی غیر ملک میں پڑھنے نہیں گئے کسی نے اُنہیں سکھایا نہیں ۔ پس وہی ایک کچا فرش اور کچی عمارت تھی مسجدِ نبوی کی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معلم تھے۔ اور یہ تعلیم بھی عجیب تھی کہ سوائے انتہائی ضروری بات کے حضورؐ نے کبھی کوئی بات ارشاد نہیں فرمائی ۔ دینی موضوع ہی سہی اس میں پانچ پانچ چھ چھ سات سات گھنٹے میں نے مسلسل تقریریں کی ہیں ۔ تو اسی طرح علماء کا رجحان ہے ۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے تقریر فرماتے ۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ عام وقت ہے تقریر کا ۔ کتنی گرج دار آواز اور کتنی سُر اور لب و لہجہ سے پڑھتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی کوئی لمبی تقریر نہیں ملتی ۔ کتنا اہم ہے حجۃ الوداع کا خطبہ کہ حضورؐ پوری امت کو رخصت فرما رہے ہیں ۔ رخصت ہو رہے ہیں ۔ الفاظ ہی ایسے ہیں لیکن وہ بھی چند سطریں ہیں ۔ اور چند گنے چُنے الفاظ جن میں دنیا بھر کے حقائق سمو دیئے ہیں ۔ حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ہاں لمبی تقریریں نہیں ہوتی تھیں ۔ چھوٹی مختصر بات پُر از مغز حسین اور خوبصورت ۔ بیشتر وقت بیٹھنے والوں کا خاموشی میں بسر ہوتا تھا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہ کرامؓ حضورؐ کی محفل میں یوں بیٹھتے تھے جیسے اُن کے سروں پر آکر پرندے بھی بیٹھ جائیں ۔ پرندے بھی خطرہ محسوس نہیں کریں گے ۔ یہی سمجھیں گے کہ پتھر ہیں ۔ حرکت نہیں کرتے تھے ۔ آواز نہیں نکالتے تھے ۔ بے باق نگاہ سے کبھی صحابہ نے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے رُخِ انور کو نہیں دیکھا کہ کسی نے نگاہ گاڑ کر دیکھا ہو ۔ ہمیشہ نگاہ نیچی کیے دست بستہ مؤدب ۔ لیکن یہ خاموشی اُنھیں اتنا کچھ پڑھا گئی کہ وہ کائنات

کے معلم بن گئے۔ یہ علم لدنی ہوتا ہے۔ جو الفاظ
کتب اساتذہ کا محتاج نہیں ہوتا۔ اللہ کی طرف
سے عطا ہوتا ہے۔

اور جتنا علم انبیاءؑ کو عطا ہوتا ہے، ولی اس
کے کروڑویں حصّے کو بھی نہیں پا سکتا۔ اُسے
ہضم ہی نہیں کر سکتا۔ اُسے برداشت ہی نہیں
کر سکتا۔

تو حضرت خضر ولی تھے۔ قطب مدار تھے
اپنے عہد کے اپنے دور کے موسٰے علیہ السلام نبی
رسول اور اولوالعزم رسول تھے ــــ کہاں موسٰے
علیہ السلام کا مقام ــــ اور موسٰے علیہ السلام کے
مقابلے میں ہم سے کروڑوں درجے اعلیٰ ہوں گے
لیکن موسٰے علیہ السلام کے مقابلے میں تو حضرت
خضر علیہ السلام کا کوئی مقام نہیں مگر اس کے باوجود
اللہ کریم نے اپنی قدرت اپنی حکمت اپنی عظمت
اپنا قانون اپنی تقسیم کا تماشا دکھانا چاہا حضرت
موسٰے علیہ السلام کو تو انہیں فرمایا کہ جاؤ وہاں
میرا ایک نمائندہ ہے وہاں جا کر دیکھو جب
دینے پر آتا ہوں تو کس کس کو کیا کیا دیتا
ہوں اور اندازہ کرو کہ میری عطا کتنی وسیع ہے۔
موسٰے علیہ السلام وہاں پہنچے ـ عرض کی
میں کچھ دن آپ کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔

هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى ..... رُشْدًا ــــ
(کہف : ۶۶) کہ اللہ نے تیرے علم کی بڑی تعریف
کی ہے۔ میں بھی تیرے ساتھ چند روز رہوں اگر
تُو اس اعلیٰ تعلیم میں سے ــــ اُس بہترین تعلیم
میں سے کچھ باتیں مجھے بھی سکھا دیں۔

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا

آپ کی عظمت آپ کی نبوت رسالت آپ کا
نشان اپنی جگہ پر لیکن میرے ساتھ رہنے کا
حوصلہ نہیں ہے۔

کیوں وجہ فرمایا وَكَيْفَ تَصْبِرُ
عَلٰى ..... خُبْرًا ۝ (کہف : ۶۸)
اُن پر آپ کیسے صبر کریں گے جن کی آپ کو ہوا بھی
نہیں لگی۔ جب آپ جانتے نہیں ہوں گے
تو آپ کیسے خاموش رہ سکیں گے ــــ تو
موسٰے علیہ السلام نے وعدہ کیا نہیں میں خاموش
رہوں گا۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ فرمایا
چلو چلتے ہیں دریا کے کنارے پر ــــ وہاں ایک
کشتی کھڑی تھی۔ انہوں نے بڑی عزت کی۔
انہوں نے ان سے کشتی کا کرایہ بھی نہیں لیا۔
تو جب دریا کے کنارے پر پہنچے تو خضرؑ نے
ایک جگہ تختے پر ہاتھ پھیرا تو وہاں سے تختہ
چیر گیا۔ کشتی والوں کو تو خبر بھی نہ ہوئی بیچاروں

کر کیا ہو گیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے پکڑ لیا کہ اچھا شریف آدمی ہے۔ انہوں نے عزت کی۔ پیسے بھی نہیں لیے سواری کرائی اور تُو ان سب کو ڈبو دینے پہ تُلا ہُوا ہے۔ تُو نے ان کا تختہ چیر کے رکھ دیا۔ عرض کی مَیں نے پہلے عرض کیا تھا حضرت آپ چُپ نہیں رہ سکیں گے۔ فرمایا بھائی میں بھُول گیا تھا۔ چلو خیر ہے تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ کچھ دُور چلے تو ایک کم سن بچہ کھیل رہا تھا خضر علیہ السلام نے اُسے قتل کر دیا اُس کی گردن مروڑ دی موسےٰ علیہ السلام سے نہ رہا گیا انہوں نے کہا غضب خدا کا کچھ خدا کا خوف۔ کچھ طریقہ بالکل اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ط (کہف : ۷۴) ایک معصوم بچے کو بغیر کسی قصور کے تم نے قتل کر دیا۔ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا۔ بہت ناپسندیدہ بات کی ہے آپ نے۔ اس پر خاموش رہنا شرافت ہی نہیں ہے انہوں نے پھر وہ بات یاد دلائی۔ فرمایا : قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ . . . . مَعِيَ صَبْرًا۔ (کہف : ۷۵) مَیں نے عرض نہیں کی حضرت آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے۔ انہوں نے کہا، بھائی قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا . . . . قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ۝ اگر اس کے بعد کسی بات پر مَیں نے پوچھا فَلَا تُصَاحِبْنِيْ پھر تو مجھے ساتھ نہ رکھیں قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ۝ میری طرف سے بہترین عذر معذرت ہو چکی ہے۔ پھر چل پڑے حتیٰ کہ ایک گاؤں میں پہنچے۔ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ . . . . اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا۔ ایسا شہر تھا کہ اہلِ شہر نے روٹی تک دینے سے انکار کر دیا۔ بھوک لگی ہوئی تھی۔ کھانے کو پورے شہر میں سے کوئی نہیں دے رہا تھا۔ فَوَجَدَ فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ . . . . ایک دیوار تھی جو گرنے کے قریب تھی فَاَقَامَهٗ (سورہ کہف : ۷۷) خضر علیہ السلام نے اُسے سیدھا کر دیا۔

موسیٰ علیہ السلام سے نہ رہا گیا۔ کہنے لگے، یار کبھی تُو اس طرح نظر آتا ہے کہ بے گناہ بچے کو تُو نے قتل کر دیا۔ اتنا سخت دل انسان اور یہاں تُو اتنا نیک بنا ہُوا ہے کہ بغیر اجرت کے وہ کھانا دینے کو تیار نہیں تُو ان کی دیواریں سیدھی کرتا پھرتا ہے۔ کم از کم لَوْ شِئْتَ . . . اَجْرًا کم از کم مزدوری لے کر سیدھی کرتا۔

انہوں نے کہا موسیٰ علیہ السلام بات ختم ہو گئی۔ آپ کا وعدہ تھا اگر سوال کیا تو میں تم سے

علیحدہ ہو جاؤں گا لیکن میں جانے سے پہلے آپ کو اُن باتوں کی تعبیر ضرور بتاؤں گا۔ جن پر آپ حیران ہوئے۔

تو یہ جو آیات میں نے تلاوت کیں ان میں ان باتوں کی تعبیر ارشاد فرمائی خضر علیہ السلام نے اَمَّا السَّفِیْنَۃُ . . . . یَعْمَلُوْنَ فِی الْبَحْرِ (سورہ کہف : ۷۹) یہ جو کشتی ہے اس کا مالک اس کا خاندان یہ مسکین ہے اور یہ اُن کا ذریعہ معاش ہے۔ کہ وہ اس دریا میں سے گزرنے والوں کے لیے کشتی چلائیں فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَہَا . . . . کُلَّ سَفِیْنَۃٍ غَصْبًا۔ (سورہ کہف : ۷۹)۔ یہ بے چارے نہیں جانتے لیکن دوسرے کنارے پر بادشاہ نے حکم دے رکھا ہے کہ ہر کشتی کو پکڑ لیا جائے فوج کی بیگار کے لیے . . . تو اُس نے تمام کشتیوں کو پکڑنے کا حکم دے دیا ہے فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَہَا۔ میں نے چاہا کہ اس کشتی میں کیڑ ڈال دوں۔ پھر اسے یہ مرمت کریں گے۔ بادشاہ اسے ناکارہ سمجھ کر چھوڑ دے گا۔ اور ان غریبوں کا روزگار خراب نہیں ہوگا۔

خضر اور موسےٰ علیہ السلام کی بات جو بعد میں عرض کروں گا۔ یہاں جو ایک بات آگئی ہے وہ عرض کرتا چلوں۔ کتنا اہتمام کیا رب کریم نے کشتی کو بادشاہ کے غضب سے بچانے کا۔ کہ خضر علیہ السلام کو خصوصاً مقرر فرما دیا۔ وہاں تشریف لے گئے اور کشتی کو عیب دار کیا کہ بادشاہ نہ لے لے تو اُس کی وجہ کیا بتائی فَکَانَتْ لِمَسٰکِیْنَ اُس کے مالک جو ہیں نا وہ بڑے مسکین ہیں۔

مسکین سے مُراد یہ نہیں ہوتا کہ اُس کے گھر میں کھانے پینے کے لیے کچھ نہ ہو۔ مسکین سے مراد یہ نہیں ہوتا کہ اُس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہوں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی جو احادیثِ مبارکہ میں موجود ہے، اللھم احیینی مسکینا وّ امتنی مسکینا وّ احشرنی فی زمرۃ مساکین۔ اور کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ کہ بارِ خدایا مجھے مسکین زندہ رکھ۔ مجھے مسکینی کی حالت میں موت دے اور مساکین کے ساتھ قیامت کے دن حشر فرما۔

مسکین اصطلاح قرآن میں کون ہے! وہ شخص جو اللہ کی عظمت سے آشنا ہو اور بڑائی اللہ کی طرف سمجھے۔ اور عجز اور درماندگی اور محتاجی کو اپنا خاصہ سمجھے۔ جو خدا کی زمین پر خدا کے مقابلے میں خدا بن کر نہ بیٹھے۔ جہاں

رائی برابر تکبر آگیا وہاں مسکنت اُٹھ گئی ۔ خواہ کوئی ارب پتی ہو لیکن اُس دولت کو خدا کی امانت سمجھتا ہو تو مسکین ہی ہو گا۔

دیکھا ہم نے کتنے ملازم رکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے لاکھوں روپے اُن کے ہاتھوں سے آتے ہیں۔ کبھی کسی منشی نے اپنے آپ کو ارب پتی سمجھ لیا ہے۔ وہ لے آتا ہے مالک کے لیے بنک میں دے آتا ہے۔ اپنے بارے میں جب سوچتا ہے تو اُسی دو سو تین سو روپے کے اندر سوچتا ہے جو اُسے مہینے کے بعد ملیں گے۔

تو اگر انسان بھی اِس کائنات کو اللہ کی ملکیت سمجھے اور اس بات کو جان لے کہ لاکھوں روپے جو میرے پاس ہیں یہ میرے نہیں ہیں۔ مَیں ایک منشی ہوں ایک امین ہوں ۔ اللہ کی طرف سے مقرر ہوں ۔ اُس نے مجھے بخشے ہیں۔ اور اُس نے مجھے ایک خاص طریقے سے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ حلال اور جائز کاموں میں کھا بھی سکتا ہوں مکان بنا بھی سکتا ہوں ۔ لباس پہن بھی سکتا ہوں ۔ لیکن مالک کی دولت ہے اُسی کی نافرمانی مَیں اسی سے نہیں کر سکتا ۔ اس کے دو فائدے ہوں گے ۔ ایسا شخص ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی کرنے کے قریب نہیں جائے گا۔ جب ہے ہی خدا کی دے کر بھی اُسی کو جانا ہے تو پھر جھوٹ بولنے ہیرا پھیری کرنے ناجائز ذرائع سے حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور ناجائز کاموں پہ خرچ بھی نہیں کرے گا۔ سمجھے گا میری نہیں ہے۔ جس کی ہے جہاں اُس نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہاں کروں گا۔ اگر ہمارا رویّہ یہ ہو اس کا بدلہ اللہ کی طرف سے یہ ہوتا ہے کہ اُس کے فرشتے اُس کی بابرکت ارواح اس بات پہ مقرر ہو جاتے ہیں کہ اس شخص کے مال کی حفاظت کرو۔ اس کے گھر کی حفاظت کرو۔

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کسی گاؤں میں بد دیانتی در آتی ہو، لین دین میں جب تولنے میں کم تولتے ہوں، بیچنے میں دھوکہ کرتے ہیں تو ایسی قوموں پر اللہ تعالیٰ قحط مسلط کرتے ہیں۔ قحط صرف یہ نہیں ہوتا کہ بارش نہ برسے غلّہ کم ہو قحط ہو قحط یہ بھی ہوتا ہے کہ کروڑوں روپے پاس ہوں اور کھانے کو کچھ نہ ملے۔

ایک دفعہ آرمی کالج میں فورڈ کمپنی کا مالک آیا تھا۔ اِن کا طریقہ یہ ہے ورلڈ سپیکر بلاتے ہیں۔ دنیا سے معروف انسانوں کو وہاں

تقریر کرنے کے لیے وہ روئے زمین سے لوگوں کو بلاتے ہیں۔ دنیا کے مشاہیر کی باتیں یہ لوگ سنتے ہیں ــــ اور اللہ کا احسان یہ ہے کہ اتفاق یہ ہے کہ قرآن کے موضوع پر اور دینی موضوع پر جب سے وہ سکول بنا ہے اُس میں سب سے پہلے خدا نے مجھے سعادت بخشی ہے کہ اُس میں مَیں نے قرآن کریم پر تقریر کی ہے ــــ تو وہ تقریر جب کر چکا تو کسی نے اس سے پوچھا کہ آپ کے حالات کیسے ہیں آپ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں ــــ وہ ایک ایسا آدمی ہے جس کے کارخانے میں ایک منٹ میں کئی ہزار موٹریں اسمبلڈ ہو جاتی ہیں۔ فی منٹ کئی ہزار کی اوسط ہے۔ یہ چلنے فورڈ ٹرک، فورڈ کاریں فورڈ بسیں جتنی ہیں یہ سب اُسی کے کارخانے کی ہیں ــــ اور کئی ہزار کاریں ایک منٹ میں آٹھ دس ہزار کے قریب اسمبلڈ ہو جاتی ہیں۔ اُس کی دولت کا اندازہ نہیں ہے حکومت امریکہ کی جو ہے وہ اکثر اُس کی مقروض رہتی ہے ــــ تو وہ کہنے لگا خدا نے مجھے دولت اتنی دی ہے کہ شاید دنیا میں کسی کے پاس نہ ہو۔ لیکن میں صرف چنے اُبال کر اُس کا پانی پی سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ دنیا کی کوئی چیز نہ کھا سکتا ہوں نہ ہضم کر سکتا ہوں ــــ اتنی زبردست گرفت ہے اللہ العالمین کی کہ بے حساب ان گنت دولت دے کر اسے کھانے سے روک دیا ــــ یہی حال آپ دیکھ لیں کہ ہم چھینا جھپٹی کر کے ہم کتنا جمع کرتے ہیں۔ ہم مال دوسرا دکھاتے ہیں بیچتے دوسرا ہیں۔ نرخ اور بتاتے ہیں دکھاتے اور ہیں دیتے اور ہیں۔ خصوصاً ہمارے کوئلے کے کاروبار میں۔ لیکن اگر ہم بیٹھ کر غور کریں تو جتنی دولت اس طرح سے آتی ہے کتنی مصیبتیں اپنے ساتھ لاتی ہے کہ آدمی اس گڈریئے کو دیکھ کر حسرت کرتا ہے کہ جنگل میں بھیڑیں چرا رہا ہے اور روکھی سوکھی مل جائے تو مزے سے ڈنڈ پیلتا ہُوا جا رہا ہے اور یہاں حال یہ ہے کہ ایک انڈہ کھا لیا تو لاہور تک ہسپتالوں میں گھسیٹنا پڑا یہ نہیں ہوتا کہ اُسے کوئی سزا نہیں ہوتی۔ اللہ کی طرف سے اِس دنیا میں بھی تکالیف پیدا ہو جاتی ہیں حفاظتِ الٰہیہ ہٹ جاتی ہے اور جب حفاظتِ الٰہیہ اُٹھالی جائے تو بے شمار پریشانیاں در آتی ہیں۔

اور اگر اپنے آپ کو اللہ کا بندہ سمجھے اپنے آپ کو بے بس و مسکین جانے اور جانے کہ یہ دنیا یہ جہان یہ زندگی یہ مال سب اللہ کا ہے اور مجھے اللہ کا بندہ بن کر رہنا ہے تو اُس کی وہ مسکنت

لیکن اگر ہم بیٹھ کر غور کریں کہ پھر خضر جیسے لوگ اُس کی اُس کے مال کی حفاظت و نگرانی کرتے ہیں۔ اللہ کے اتنے مقبول بندے اُس کے علم میں نہیں ہوتا لیکن وہ اُس کے مال کی حفاظت پہ لگے ہوتے ہیں

فرمایا یہ جو لڑکا میں نے قتل کر دیا ہے وکان ابوہ مومنین اُس کی ماں اور باپ دونوں نیک ہیں۔ اس کی ماں بھی نیک ہے اِس کا باپ بھی نیک ہے ـــ وہ دونوں نیک ہیں لیکن یہ بچہ ایسا ہے فخشینا ان یرھقھما ... کفرا o (کہف: ۸۰) کہ یہ بڑا ہو کر دین پہ نہیں رہ سکے گا۔ کافر بھی ہوگا اور سرکش بھی ہوگا۔ خدا کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ میرے نیک بندوں کو یہ تنگ کرے ۔ تو اس نے ان یبدلھما ربھما ... رحما o (سورہ کہف: ۸۱) اُس نے اسے اُٹھا لیا اور اس کی جگہ انہیں نیک لڑکا عطا کرے گا۔ بالکل اسی طرح ہوتا ہے۔ جو شخص جب مرتا ہے نا اُس وقت اس کو ضرور مرنا چاہیے۔ یہی اُس کے حق میں بہتر ہوتا ہے ۔ میں اور آپ نہیں جانتے لیکن وہ جاننے والا ضرور جانتا ہے۔

جب ساتھ کے لوگ بیٹے بھائی رشتہ دار عزیز دنیا سے اٹھا لیے جاتے ہیں دُکھ ہوتا قدرتی بات ہے۔ جب وجود کا ایک حصہ کٹتا ہے تو درد تو سارے کو ہوتا ہے۔

لیکن یہ خوب سمجھ لو کہ وہ کسی کے ساتھ ظلم نہیں کرتا۔ جو شخص بھی جب موت کے منہ میں چلا جاتا ہے تو اُس وقت اُس کا مرجانا ہی اُس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ بدکاروں کے ساتھ یہ اہتمام نہیں کیا جاتا اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ بدکار لوگ اکثر ذلیل ہو ہو کر مرتے ہیں۔ محتاج ہو ہو کر خراب ہو ہو کر پریشان ہو ہو کر بلکہ مہینوں مرتے رہتے ہیں اور موت نہیں آتی لیکن والدین یا کسی کی ذات کی نیکی جو ہوتی ہے اس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ اللہ کریم اُن کے لیے نیک لوگ مہیا کر دیتا ہے نیک اولاد مہیا کر دیتا ہے نیک دوست مہیا کر دیتا ہے۔ نیک رفاقت مہیا کر دیتا ہے۔ اگر انسان کے اپنے وجود میں نیکی موجود ہو۔ اور اگر خود وجود نیکی سے عاری ہو تو پھر کیا مکے میں رہتے ہوئے بھی لوگ حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی صحبت سے محروم نہ رہے۔ پھر نیک لوگوں کے پاس رہتے ہوئے بھی نیکوں کی صحبت نصیب نہیں ہوتی لیکن اگر خود نیکی اختیار کرلے تو اس کے

طفیل کہاں تک اہتمام کرتا ہے۔
اور اگلی بات فرمائی وَاَمَّا الْجِدَارُ
یہ جو دیوار میں نے مرمت کی ہے
یہ دو یتیموں کا مکان ہے
اُس کی یہ دیوار گر رہی تھی
اِس دیوار کے نیچے اُن بچوں
کے لیے خزانہ دفن کیا ہوا تھا
پھر بات وہیں پہنچی۔ فرمایا
کہ موسیٰؑ اُن کا باپ نیک شخص تھا، تو اس نے
جب موت کے قریب پہنچا تو جو پونجی اُس کے
پاس تھی۔ اُس نے اِس دیوار کے نیچے دفن کر دی
میرے بچے جوان ہوں گے تو تلاش کر لیں گے۔ اب
یہ دیوار گرنے والی تھی۔ بچے چھوٹے ہیں۔ یہ
گرتی بکھر جاتی پونجی لوگ اٹھا لیتے۔ یتیم ہیں چھوٹے
چھوٹے بچے ہیں وَاَرَادَ رَبُّكَ فرمایا
یہ تیرے ربّ نے چاہا ہے اَنْ يَّبْلُغَا ...
... كَنْزَهُمَا تیرے ربّ کی پسند
یہ ہے کہ یہ خود جوان ہوں اور یہ خزانہ خود نکال
لیں۔ تو اُس نے مجھے حکم دے دیا ہے کہ ان
کی دیوار سیدھی کر دو اور یہ جتنے کام میں نے
کیے ہیں مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ۔ میں نے
اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا۔ نہ میں نے اپنی
مرضی سے کشتی کو چیرا ہے۔ نہ میں نے اپنی مرضی
سے کچھ بھی نہیں کیا ہے نہ میں نے اپنی مرضی
سے دیوار کو بنایا ہے۔ یہ کیا تھا وَمَا
فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ میں نے اپنی طرف
سے کچھ نہیں کیا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ
یہ سب تیرے ربّ کی رحمت بٹ رہی تھی۔
تیرے ربّ کی رحمت تقسیم ہو رہی تھی۔ میں
تو بانٹنے والا پہنچانے والا تھا۔ دینے والا وہ
خود تھا۔ بظاہر تکلیف دہ نظر آتے ہیں دو کام
کشتی کا ٹوٹنا اور لڑکے کا قتل ہونا لیکن اُن
میں بھی تیرے ربّ کی رحمت مقصود تھی۔ اُن میں
بھی انہی کا فائدہ مطلوب تھا اور دیوار کی تعمیر
بھی تیرے ربّ کی رحمت تھی۔ مَا فَعَلْتُهٗ
عَنْ اَمْرِیْ میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں
کیا۔ خدا نے حکم دیا میں نے کر دیا۔
ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ ... صَبْرًا۔
جس بات پر آپ صبر نہیں کر سکے اُس کی تعبیر
یہ ہے:
تو یہ بات ایسی بنتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام
نبی اور رسول تھے اور رسول کا علم جو ہوتا ہے،
وہ پیغاماتِ الٰہیہ کو پہنچانا اللہ کی مخلوق تک۔
یا جو امورِ رسالت کے ضمن میں آتے ہیں۔

تعمیر اخلاق کے عقائد کے یا زندگی بسر کرنے کے جو اصول ضروری ہوتے ہیں وہ سارے نبی ارشاد فرماتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ نبی ڈرائیوری بھی جانتا ہو۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر نبی موٹر مکینک بھی ہو۔ اسی طرح سے یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ دنیا میں جو تقدیر نافذ ہوتی ہے اسے ضرور نبی جانتا ہو چونکہ یہ نبی کا شعبہ نہیں ہے اور نہ ہی اس میں نبی کا شان کم ہو جاتا ہے۔ دیکھیں کتنے فرشتے کام کرتے ہیں مخلوق میں ہر فرشتہ علیحدہ فریضے کو کوئی بارش برسانے پر ہے۔ کوئی پہاڑوں پر مقرر ہے۔ کوئی غذا اگانے پر ہے کوئی سورج کو چلانے پر ہے۔ حتیٰ کہ ایک ایک انسانی وجود کی مشین کو کئی کئی فرشتے اوپریٹ کرتے ہیں۔ ہر فرشتے کو بھی اپنے متعلقہ کام کی خبر ہوتی ہے دوسرے کی خبر نہیں ہوتی۔

تو حضرت خضر علیہ السلام بعد از وفات ان کی روح ملائکہ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ جس طرح فرشتے تکوینی امور کو بجالاتے ہیں اسی طرح ان کی روح کو بھی اللہ کریم نے یہ شرف بخشا ہے کہ وہ ملائکہ کی طرح اللہ کے احکام کو نافذ کرتے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا موسیٰؑ اس میں میرا تو کچھ نہیں۔ میرا تو کوئی دخل نہیں۔ میں تو حکم کا بندہ ہوں۔ جہاں اللہ نے حکم دے دیا کام کرنے کا وہ کر دیا۔ اب یہ متعلق تھا خضر علیہ السلام سے۔ موسیٰ علیہ السلام ساتھ بھی تھے اور موسیٰ علیہ السلام کا شان بھی بڑا تھا لیکن اس کا شان اس سے بھی بلند تر ہے کہ خضر سے بات کرلی اور موسیٰؑ کے کان میں بات نہیں ڈالی۔ موسیٰؑ کو محسوس بھی نہیں ہو سکا کہ خضر سے کب کہہ دیا اللہ نے۔ گویا عظمت ہمیشہ اسی کی طرف ہے۔ انبیاء و رسل کا اپنا ایک مقام ہے جس میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔

یہ اس طرح سے واقعہ ہوا کہ جیسے ایک بہت بڑا فاضل موٹر میں سواری کرتا ہے لیکن موٹر چلانا نہیں جانتا اور ایک عام جاہل سا آدمی اَن پڑھ بہت اچھی موٹر چلا لیتا ہے تو اس میں اَن پڑھ اُس عالم سے افضل نہیں ہو جاتا کیونکہ اس کے علم کا تقاضا موٹریں چلانا نہیں ہے۔ تعمیر انسانیت ہے۔ یہاں بھی امورِ تکوینیہ کو نافذ کرنا انبیاء و رسل کا شعبہ نہیں ہے اُن کا شعبہ تعمیر انسانیت ہے۔ اور امورِ تکوینیہ کو تقدیرِ الٰہی کو نافذ کرنے کا سبب جو بظاہر بنتے ہیں وہ فرشتے بنتے ہیں۔ تو خضر علیہ السلام کو اللہ نے یہ شرف بخشا کہ دنیا سے اُٹھنے کے

بعد اُن کی روح کو ملائکہ کی صف میں شامل کر دیا یہ اُس کی اپنی ادا ہے۔ یہ اُس کا احسان ہے۔

تو خداوند کریم نے ان واقعہ کو ان تینوں عجیب واقعات کو بیان کرنے کے بعد ثابت فرمائی ہے کہ نیکی کسی حال میں ضائع نہیں جاتی۔ اور ایک ایک نیک آدمی کے طفیل کئی کئی خاندان اللہ کی طرف سے تحفظ دیئے جاتے ہیں اور بچائے جاتے ہیں اور بظاہر جن باتوں کو ہم مشکل یا مصیبت سمجھتے ہیں اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ انہیں میں ہمارا بھلا ہوتا ہے۔ اور اللہ ہماری بہتری کے لیے وہ کام کر رہے ہوتے ہیں۔

سو ایک مسلمان کا تعلق ذاتِ باری سے ہمیشہ ایسا ہونا چاہیئے اللہ کی طرف سے جو واقعہ ظہور پذیر ہو مسلمان کا یہ اعتماد ہو کہ میری بہتری اسی میں ہے جو میرا مالک کر رہا ہے اور ہمیشہ یہ دعا کی جائے کہ خدایا ہم نہیں جانتے ہماری بہتری کس میں ہے تو ہمارے لیے وہ کام کر جو ہماری دنیا اور آخرت دونوں کے لیے بہتر ہو۔

یاد رکھیں ہر جگہ عزت و آبرو۔ آرام و سکون نیکی سے ملتا ہے انسان اپنی اصلاح کر لے تو فرشتے اور خضر جیسے ولی اُس کی حفاظت و چوکیداری کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے کرتے ہیں۔ اور یہی انسان اگر بگڑ جائے تو خدا فرماتا ہے میں اُس پر شیطان مسلط کر دیتا ہوں۔ جب یہ میری یاد کو چھوڑ دے اُس پر شیطان مسلّط ہو جاتا ہے۔ فھولہ قرین وہ شیطان ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا ہے اور اُسے بُرائی اور گناہ میں گھسیٹتا آگے لیے چلا جاتا ہے حتیٰ کہ انسان تباہی کی موت سے دوچار ہوتا ہے۔

اللہ کریم ہم سب کو اور حاضر غائب تمام مسلمانوں کی اللہ کی یاد اور اپنی پناہ میں رکھے اپنی یاد کی توفیق عطا فرمائے۔ اور نیکی کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری ٹوٹی پھوٹی نیکیوں کو شرفِ قبولیت بخشے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

- نماز مومن کی معراج ہے۔
- نماز دین کا ستون ہے۔
- نماز جنّت کی کُنجی ہے۔
- نماز بُرائیوں سے روکتی ہے

حرمین شریفین کی حرمت

بار بار پامال کرنے والے اہلِ تشیع

تاریخ کے آئینہ میں

(ابوارقم انصاری)

حرمین پاک میں حالیہ واردا توں کا ناپاک سلسلہ

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن مجید کے مطابق حرمین مقدس کی بے حرمتی بھی حرام ہے اور خونِ مسلم بھی حرام ہے۔ اس وجہ سے ان دونوں حرمتوں کی پامالی کا سنگین جرم اور وہ بھی بیک وقت و یکجا، اس کا کوئی مسلمان ارتکاب تو کیا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایسی بنیادی حقیقت کے باوجود ۶ ذوالحجہ ۱۴۰۷ھ — (۳۱ جولائی ۱۹۸۷ء) کو ایک مرتبہ پھر ایرانی قیادت میں اہلِ تشیع نے حرم کعبہ و مسجد الحرام کی حرمت کو بھی پامال کیا۔ اور اہلِ حرم و مہمانانِ حرم کا خون بھی کیا۔ پھر یہ کہ یہ دونوں حرام کام نہ صرف بیک وقت کیے گئے بلکہ عین ایامِ حرام میں انجام دیئے گئے۔

حرمین پاک کی توہین و تذلیل کا یہ سلسلہ ناپاک ۷۹ء سے ہر سال بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ پچھلے سال تو خمینی کے ایرانی کارندوں نے سارے حرمین شریفین کو بارود سے اڑانے کی بھی جسارت کر ڈالی تھی۔ پچھلے سال ۳ ذوالحجہ ۱۴۰۶ھ (۷ اگست ۸۶ء) کو ایرانی تخریب کار اکیاون کلو

(تقریباً ڈیڑھ من) دھماکہ خیز مادے کے ساتھ جدہ ایرپورٹ پہنچے اور تلاشی پر وہیں پکڑے گئے۔ ان دہشت گردوں کا گروہ حسن علی وصفوی تھا جس نے پوچھ گچھ پر اقرارِ جرم کر لیا۔ اور اعتراف کیا کہ وہ آتشگیر بارود حرمین کو تباہ کرنے کے لیے اس کی حکومت نے بھیجا تھا۔ گذشتہ سال اور اس سال کے ان گھناؤنے واقعات کی فلمیں موقع پر ہی لے لی گئی تھیں۔ اور ان دونوں فلموں کو سعودی ٹیلی ویژن پر ۲ر اگست ۸۷ء کو پوری دنیا کے لیے دکھا بھی دی گئیں۔ بعد میں یہی تصاویر دنیا کے اخبارات و جرائد میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

حرمِ بیت اللہ میں اسلام کے خلاف تشدد و جارحیت کی حالیہ واردات نئی نہیں بلکہ ۷۹ء کے ایرانی شیعہ انقلاب سے جاری ہیں۔ فروری ۷۹ء میں خمینی انقلاب آیا اور اُسی سال ۱۹ر نومبر ۷۹ء (۱ محرم ۱۴۰۰ھ) کو ایک مسلح گروہ نے حرم کعبہ اور حرم نبوی ؐ پر بیک وقت دھاوا بول دیا۔ حرمِ نبوی ؐ پر حملہ تو ناکام بنا دیا گیا، مگر حرم کعبہ پر حملہ آوروں نے قبضہ کر لیا۔ بے شمار مسلمانوں کا بے دریغ قتلِ عام کیا اور دیگر تمام مسلمانوں کو دو ہفتوں سے زیادہ تک عمرہ، طواف کعبہ اور نماز بیت اللہ سے محروم رکھا۔ مجبوراً اس غیر اسلامی گروہ کے خلاف فوجی قوت استعمال کی گئی اور حرمِ محترم کو ناپاک قبضے سے پاک کر دیا گیا۔ اس سال کے بعد ہر سال موسمِ حج میں تقدیسِ حرمین کی مسلسل توہین و تذلیل کسی نہ کسی تشکل میں جاری رہی" تا آنکہ اس سال ۸۷ء میں ایک اور مسلح مہم کے ذریعہ حرم مکہ مکرمہ کو نشانہ بنایا گیا۔ غرضیکہ پچھلے ۸ برسوں سے قبضہ حرمین کے لیے حرمتِ حرمین روندی جاتی رہی ہے۔ اس لحاظ سے وہ بیت اللہ الحرام جسے اللہ اور رسول ؐ نے قیامت تک دنیا بھر کے مسلمانوں کا قبلہ و کعبہ (مرکزِ اسلام) اور دارالامن قرار دیا ہو، اسے دارالفساد بنانا بالیقین بغاوت ہے۔ اللہ سے اور رسول ؐ سے۔ اسی طرح اہلِ حرم اور زائرینِ حرم کو تہہ تیغ کرنا کھلی غداری ہے دینِ اسلام سے اور اہلِ اسلام سے۔

مختصراً یہ کہ ۷۹ء کے ایرانی انقلاب سے ہی اہلِ تشیع کے لیڈر خمینی کا اصل ہدف اہلِ اسلام اور مرکزِ اسلام کی غاصبانہ تسخیر اور تباہی ہے۔ ان تازہ ترین حقائق کے علاوہ اہلِ تشیع اور خمینی کے مذموم مقاصد کے دستاویزی

ثبوتِ مزید تاریخی مناظر کے ساتھ، اگلی سطور میں پیش کیے جاتے ہیں۔

مرکزِ اسلام اور اہلِ اسلام کے خلاف سازشوں کا تاریخی تسلسل

تاریخ شاہد ہے کہ حضورِ اکرمؐ کی قائم کردہ مضبوط و مستحکم اسلامی مملکت حضرت عثمانؓ کے درخشاں دورِ خلافت میں عروج پر پہنچ کر دشمنانِ اسلام کے بیرونی حملوں کے لیے ناقابلِ تسخیر بن چکی تھی۔ لہٰذا عیار یہود نے اس عظیم اسلامی ریاست کو اندرونی طور پر سبوتاژ کرنے کی سازش کی۔ اس مقصد کے لیے یہودی دماغ ابنِ سبا نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر شیعیت کو جنم دیا تاکہ ملتِ اسلامیہ کو داخلی انتشار و خلفشار سے شکار کیا جا سکے۔ بالفاظِ دیگر شیعہ مذہب کی پیدائشی غرض و غایت ہی یہ تھی کہ اندر سے نہ صرف مرکزِ اسلام کو درہم برہم کیا جائے بلکہ اہلِ اسلام کو بھی تتر بتر کر دیا جائے اس گہری اور ہمہ گیر سازش کے ساتھ ابنِ سبا یہودی نے ملک حرمین میں فتنہ و فساد، مسلمانوں کی خونریزی، اور حرم نبویؐ کی بے حرمتی سے شیعی مشن کا آغاز کیا جو آج بھی جاری ہے۔

اب اس تاریخی تسلسل کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں تاکہ اس آئینہ میں شیعیت کا روپ بہروپ صاف دیکھ لیا جائے۔

(۱) شیعہ مذہب کے بانی ابنِ سبا یہودی نے اسلام کے خلاف اوّلیں چال یہ چلی کہ قرآن کی معیّن تعریف "اہلِ بیت" (امہات المومنینؓ) کے صریحاً منافی رسولِ اکرمؐ کے نسبی رشتہ دار کو "اہلِ بیت" کہنا شروع کر دیا، پھر اس نے اپنے خود ساختہ اہلِ بیت کو صحابہ کرام کے زمرے سے الگ ایک جداگانہ طبقہ ظاہر کیا۔ اس کے بعد سنت کے قطعی خلاف اس شیعۂ اوّل نے اپنے نام نہاد جداگانہ طبقے کی فضیلت و افضلیت کا پروپیگنڈہ کیا، پھر بڑے پیمانے پر بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان باہمی نفرت و منافرت کا چکر بھی چلا دیا۔ دریں اثنا اس مکار منافق نے امیر المومنین حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے مابین غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی، اور امام الوقت ذوالنورینؓ کے خلاف بہتان طرازی کا طوفان کھڑا کر دیا۔ غرضیکہ فریب و فراڈ کے ان مختلف ہتھیاروں کے ساتھ بابائے شیعیت کا یہودی النسل لڑکا خلافتِ عثمانؓ پر شب و روز شب خون مارتا رہا۔

یہاں تک کہ وہ اسلام کے خلاف اپنی اوّلیں سازش کے حتمی ہدف پر پہنچ گیا۔ بالآخر ان شیعہ شیاطین نے دامادِ رسولؐ حضرت عثمان رضؓ کو حرمِ نبویؐ میں اور عین ماہِ حرام (ذوالحجہ ۳۵ھ) میں نہایت درندگی و سفاکی سے شہید کر دیا۔ اِس طرح اہلِ تشیع نے پیدا ہوتے ہی قرآن و سنت کے خلاف بیک وقت حرمِ رسولؐ کی کھلی بے حُرمتی کی، ماہِ حرام کی حُرمت بھی پامال کی اور خونِ مسلم جیسی حرام کاری بھی کی۔ مختصراً یہ ہیں حرام در حرام کے وہ سیاہ ترین اعمال اور سنگین جرائم جو ابتدا سے لے کر آج تک ہمیشہ ہی شیعوں کا شیوہ رہے ہیں۔

(۲) اگلے دورِ خلافتِ علی رضؓ میں قاتلانِ حسین نے مرکزِ اسلام کو مزید منہدم کرنے کے لیے اپنی منافقانہ مہم کو تیز تر کر دیا۔ مسلمانوں کے بھیس میں ان منافقوں نے بہت بڑے پیمانے پر سیاسی افراتفری پھیلائی اور پہلے سے پیدا کردہ نفاق و افتراق کی آگ شدت سے بھڑکائی تاکہ مسلمانوں کے مابین پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں آگے چل کر خود بخود باہمی جنگ و جدال تک پہنچ جائیں۔ اتحادِ امت کو پارہ پارہ کرنے والے ایسے خطرناک حالات ابھارنے کے بعد ان چالبازوں نے حضرت علی رضؓ کو مجبور کر دیا کہ وہ مرکزِ خلافت یعنی مدینۃ النبیؐ چھوڑ دیں اور باہر سے اصلاحِ احوال انجام دیں۔ صورتِ حال کو درست کرنے کے لیے اگرچہ حضرت علی رضؓ نے اپنی دانست میں ہر تدبیر اختیار کی، تاہم مفسدین (قاتلانِ عثمان رضؓ) نہ صرف سزا سے بچ نکلے بلکہ ملک کے چاروں اطراف جا پہنچے تاکہ اگلے مرحلہ میں ملک گیر تخریب کاری اور مسلمانوں کا قتلِ عام کرا سکیں۔ بہرکیف اسلام سے بغض و عداوت رکھنے والے اہلِ تشیع نے سیاسی اختلافات کی آڑ لے کر مختلف شورشیں شروع کر دیں اور رفتہ رفتہ مسلمانوں کے درمیان پے در پے تین خانہ جنگیاں (جنگِ جمل، جنگِ صفین اور جنگِ نہروان) بھی بپا کرا دیں۔ اس کے نتیجہ میں ہزاروں مسلمانوں کو ہلاک کر دیا گیا، عظیم گلشنِ ملت کو اُجاڑ دیا گیا اور آخر میں خلیفۂ وقت حضرت علی رضؓ کو بھی ۴۰ھ میں شہید کر دیا گیا۔ غرضیکہ پانچ سال کی مختصر مدت میں ابنِ سبا اور یہودی اور اس کے چیلوں نے لبادۂ اسلام میں اہلِ اسلام اور مرکزِ اسلام کو بڑی حد تک مسمار کر ہی ڈالا۔

(۳) شہادتِ سیدنا عثمان رضؓ سے لے کر شہادتِ سیدنا علی رضؓ تک کے ناقابلِ تلافی ملی نقصانات کے بعد ہر چند کہ مسلمان مہلک مرضِ شیعیت کی تشخیص کر چکے تھے، تاہم وہ اس

مرض کا مداوا کرنے کے لیے خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہتے تھے۔ قبل اس کے کہ اہلِ اسلام کوئی اقدام کرتے، اہلِ تشیع نے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا اور یہ کہ منصبِ خلافت کو گروہی وزراعی مسئلہ بنا دیا۔ اس نازک موقع پر بلا توقف اور بروقت حضرت حسن رضؓ نے ملی مفاد میں تازہ سازش کا قلع قمع کرنے کا بیڑہ اٹھا لیا۔ انہوں نے فوری فیصلہ فرمایا کہ سازش کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے۔ ملی تفریق و تقسیم کے عمل کو ختم کر دیا جائے اور مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد کو بحال کر دیا جائے۔ ان اعلیٰ مقاصد کی خاطر حضرت حسن رضؓ نے عظیم ایثار کیا۔ اور حضرت معاویہ رضؓ جیسے مردِ مسلمان و مردِ آہن کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے ہمیشہ کے لیے ایک روشن مثال قائم کر کے نہ صرف شیعہ نقاب پوشوں کو بے نقاب کیا اور مسلمانوں کو کشت و خوں سے بچا لیا بلکہ اتحادِ ملی مکمل بحال کر کے وقت کا بہترین قائد اُمت بھی فراہم کر دیا۔ ایسے تاریخ ساز اقدام سے چونکہ اہلِ تشیع بالکل ننگے ہو چکے تھے، اور شکست کھا چکے تھے، اس لیے زیرِ زمین چلے گئے مگر موقع نکال کر انہوں نے محسنِ ملت حضرت حسن رضؓ کو اُن کے لاثانی کارنامے کی پاداش میں خاموشی سے زہر دے کر حرمِ نبوی میں (حسبِ سابق) شہید کر دیا۔ البتہ قاتلانِ حسن رضؓ اُس اجتماعی سیسہ پلائی دیوارِ ملت میں کوئی شگاف نہ ڈال سکے۔ جس کی بنیاد حضرت حسن رضؓ نے رکھی تھی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہ کی بیس برسوں کی مضبوط خلافت (۴۱ھ تا ۶۰ھ) کے دوران نہ صرف داخلی طور پر مسلم اتحاد انتہائی مستحکم ہوا اور مرکزِ اسلام کا پیدائشی دشمن قطعی ناکام و نامراد ہوا، بلکہ خارجی طور پر بھی مملکتِ اسلامیہ کی بڑی وسعت ہوئی اور بحر و بر دونوں پر طاقتور حکمرانی قائم ہوئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ بیس سالہ خلافتِ معاویہ رضؓ کی کامیاب خارجی و داخلی پالیسیوں اور حکمتِ عملیوں نے ایک طرف تو سازشی عناصر کو سر نہ اٹھانے دیا۔ اور دوسری طرف اسلام کی عظمت و شوکت کا پرچم ساری دنیا میں بلند و بالا کر دیا۔ اس تاریخی حقیقت کے ساتھ دوسری تلخ حقیقت یہ ہے کہ امیرالمومنین حضرت معاویہ رضؓ کا انتقال ہوتے ہی دُبکے ہوئے سانپ بچھو اپنے بلوں سے باہر نکل آئے اور ایک بار پھر حسبِ معمول جسدِ اسلام و اسلامیان کو ڈسنے اور ڈنک مارنے لگے۔

(۴) خلافتِ معاویہ رضؓ کے اختتام پر اہلِ تشیع

نے اپنے مذہبی اصول تقیہ پر عمل کیا اور بیعت کے بہانے حضرت حسین رضؓ کو مسکنِ مکہ ترک کرنے اور کوفہ پہنچنے کا پیغام دیا۔ اس حوالے سے مکہ مکرمہ میں موجود حضرات عبداللہ بن زبیر رضؓ، عبداللہ بن عمر رضؓ، عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضؓ اور ابن عباس رضؓ جیسے جید صحابہ کرام نے حضرت حسین رضؓ کو حرم بیت اللہ چھوڑنے سے روکا اور پسِ پردہ سازش سے خبردار کیا۔ لیکن کوفیوں کا آیا ہوا گروہ کسی نہ کسی طرح حضرت حسین (مع اہل و عیال) کو اپنے ساتھ مکہ سے لے گیا۔ مکہ معظمہ سے جنگِ قادسیہ تک حضرت حسین رضؓ نے حالات کا بغور مشاہدہ کیا، جس کی روشنی میں یہ حکمتِ عملی اپنائی کہ وہاں سے راہ کوفہ کی بجائے راہ دمشق اختیار کرلی۔ انہوں نے حتمی فیصلہ فرمایا کہ اپنے بڑے بھائی حسن رضؓ کی اتباع میں وحدتِ امت کو بکھرنے سے بچایا جائے۔ مسئلہ خلافت پر اجماعِ ملت قائم کیا جائے۔ ملی مرکزیت کا تحفظ کیا جائے اور دمشق پہنچ کر اپنے رشتے کے ماموں یعنی خلیفہ وقت یزید بن معاویہ رضؓ سے بیعتِ خلافت کرلی جائے۔ اس مثالی راہِ عمل سے روکنے کے لیے ہمسفر کوفی جتھے نے بڑی منت سماجت کی، مگر ناکامی ہوئی۔ بس پھر کیا تھا، اُن ساٹھ شرپسندوں نے اپنا پرانا حربہ استعمال کیا یعنی یہ کہ قافلے میں پہلے اختلاف فضا پیدا کی، پھر ہڑبونگ مچائی اور ہنگامہ آرائی کی اور آخر میں حضرت حسین رضؓ کو مقام الطف (کربلا) پر ۶۱ھ میں شہید کردیا۔ بعدازاں ان شیعہ قاتلوں نے جھوٹے پروپیگنڈے کے ذریعہ قتلِ حسین رضؓ کا الزام خلافتِ یزید بن معاویہ رضؓ پر ڈال دیا اور خود تقیہ کے تحت ماتم حسین رضؓ کرنے لگے تاکہ تمام مسلمان بالعموم دھوکہ کھا جائیں اور بنو ہاشم بالخصوص خلافتِ بنو امیہ کے خلاف نفرت میں مبتلا ہوجائیں اس طرح ہاشمی اور اموی مسلمانوں کے مابین رنجش و چپقلش کی پرانی سازش جس کی سرکوبی حضرت حسن رضؓ اور حضرت معاویہ رضؓ نے مل کر کی تھی، دوبارہ سر اُٹھانے لگی۔ پھر رفتہ رفتہ خلافتِ بنو امیہ کے خلاف کوئی سازش میں ایرانی بھی شامل ہوگئے اور بالآخر تمام منافقین نے مل کر بنو ہاشم کے نام پر خلافتِ دمشق سے بغاوت کا آغاز خراسان سے کردیا اور ۱۳۲ھ تک خلافتِ بنو امیہ کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیا۔

(۵) جب خلافتِ بنو اُمیہ کے خاتمہ پر ۱۳۲ھ میں خلافت بنو ہاشم یعنی خلافت بنو ہاشم قائم ہوئی۔ تو ان ہی داخلی دشمنوں نے اس کی جڑیں بھی کاٹنی شروع کردیں۔ کیونکہ شیعیت کا اصل مقصد تو روزِ اوّل ہی سے بہر صورت اہلِ اسلام اور مرکزِ

اسلام کو سبوتاژ کرنا تھا۔ اس مرتبہ نہ صرف یہ کہ خلافتِ بنو عباس کے خلاف بغاوت کی گئی بلکہ اس کے مدِ مقابل ایک الگ متوازی حکومت بھی بنائی گئی۔ یہ شیعہ حکومت (عبیدی فاطمی) ۲۹۷ھ میں اہلِ تشیع نے ابو طاہر قرمطی کی قیادت میں حرمِ کعبہ پر حملہ کیا اور یہ حملہ عین موسمِ حج میں کیا گیا۔ انہوں نے حجاج کرام کو قتل کیا، بیت اللہ الحرام کے دروازے توڑ دیئے، میزابِ رحمت گرا دیا۔ غلافِ کعبہ نوچ دیا اور حجرِ اسود اکھاڑ ڈالا۔ ان بدطینت شیعوں نے بیک وقت تین حرمتوں کی کھلم کھلا بے حرمتی کی یعنی یہ کہ حرمت مسجد الحرام، حرمتِ ایام حرام اور حرمتِ خونِ مسلم کو ایک ساتھ پامال کیا۔ تاریخ کی اس شہادت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام سے بغض و عناد میں تمام تخریب کاریوں کی طرح ابو طاہر قرمطی کے ہاتھوں توہینِ حرم حرم کا سلسلہ جہاں ماضی میں شیعہ اوّل ابنِ سبا یہودی سے جڑا ہوا ہے، وہیں وہ سلسلہ دورِ حاضر تک خمینی تک بھی پھیلا ہوا ہے۔ اس ضمن میں مزید تاریخی شہادتیں اگلی سطور میں ترتیب وار پیش کی جا رہی ہیں۔

(۶) مذکورہ بالا شیعہ حکومت (عبیدی فاطمی) کا چھٹا حکمران ایک انتہائی بدقماش شخص الحاکم بنا۔ جس نے ۳۸۶ھ میں مصر میں اقتدار سنبھالا۔ اس نے اپنے معتمد و مقرب ابو فتوح کو ایک انتہائی مذموم منصوبہ دے کر مدینہ منورہ بھیجا۔ منصوبہ یہ تھا کہ حرمِ نبویؐ کی حرمت کو اس طرح روندا جائے کہ حجرۂ رسولؐ اور جسدِ رسولؐ کی بے حرمتی بھی ہو جائے، مطلب یہ کہ حضورِ اکرمؐ کے محترم و مقدس حجرے میں موجود آنحضورؐ اور ان کے پہلو میں مدفون شیخین (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ) تینوں کے اجسامِ اطہر کو نکال باہر کیا جائے۔

اس ذلیل مہم پر ابو فتوح مدینہ طیبہ پہنچ تو گیا مگر بہت خائف و خوفزدہ رہا۔ اسی حال میں وہ الحاکم کے تفویض کردہ منصوبے پر عمل کرنے کی ہمت و جرأت نہ کر سکا۔ اور مدینۃ الرسول سے ناکام و نامراد ہو کر کہیں اور چلا گیا۔

(۷) اسی عبیدی فاطمی دورِ حکومت میں پھر وہی توہینِ حرم کی سازش کی گئی۔ اس بار ۴۱۱ھ میں حلب کے چالیس شیعہ تخریب کار اسی گندی و گھناؤنی اسکیم کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچے تاکہ حجرۂ نبویؐ کے انہی تینوں قبور اطہر اور اجسامِ اقدس کی تذلیل کی جائے۔ اس ذلیل

پروگرام کی خبر جب مسجدِ نبویؐ کے رئیس الخدام شیخ شمس الدین صواب کو ہوگئی تو وہ ہوشیار اور منتظر رہے۔

ایک رات پچھلے پہر کو وہ بدبخت چالیس کا ٹولہ مسجدِ نبویؐ تک ضرور پہنچا لیکن قبل اس کے کہ وہ ٹولہ حجرۂ انور تک بڑھے، خود بخود زمین دوز ہوگیا۔ یعنی شیخ صواب کے سامنے اس کو زمین نے نگل کر جہنم رسید کر دیا۔

(۸) اگلی صدی یعنی چھٹی صدی ہجری میں خلافتِ بنو عباس کو ایک مجاہد اسلام نور الدین زنگیؒ میسر آگیا۔ تو اسلام کی سیاسی مرکزیت کو تقویت حاصل ہوئی۔ اُس زمانے میں اس مردِ مومن کی قوت و حکمت نے سارے یہود، آلِ یہود (اہلِ تشیع) اور عیسائیوں کی اسلام دشمن سرگرمیوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ برسرِ زمین شکست خوردہ اس تگڈم نے اپنے انتقام کی پیاس بجھانے کے لیے زیرِ زمین ایک مشترکہ پلان بنایا۔ ان کا یہ خباثت پلان ۵۵۷ھ میں یہ بنا کہ مدینہ طیبہ میں آنحضرتؐ کی آرام گاہ اکرمؐ کے زیرِ زمین نقب زنی کی جائے اور خاتم النبیینؐ اور آپؐ کے دونوں نائبینؓ کے اجسامِ مبارک کے ساتھ گستاخی کی جسارت کی جائے۔ اس پلان کے مطابق دو تربیت یافتہ تخریب کار رایام حج میں مدینہ منورہ پہنچے اور مسجدِ نبویؐ کے قریب ترین مقام پر قیام کرکے وہاں سے حجرۂ نبویؐ تک خفیہ سرنگ بنانے لگے۔ دریں اثنا نور الدین زنگیؒ خواب میں سرورِ کائناتؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آنحضورؐ نے ان کو خواب میں نہ صرف دشمنوں کی کاروائی سے مطلع فرمادیا بلکہ دونوں مردود تخریب کاروں کے چہرے بھی دکھا دیئے۔ آنکھ کھلتے ہی مردِ مومن نور الدین زنگیؒ حرمِ نبویؐ کی جانب روانہ ہوگیا اور ٹھیک اس جگہ پہنچ گیا جہاں سے نقب زنی کے لیے سرنگ نکالی جارہی تھی۔ انہوں نے دونوں ملعون نقب زنوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور فوراً ٹھکانے لگا دیا۔ یوں نور الدینؒ نے طاغوت کا منصوبہ بر مٹی میں ملادیا۔

(۹) مردِ مومن نور الدین زنگیؒ کی ۵۶۶ھ میں وفات کے بعد ان کے اسلامی مشن کو مردِ مجاہد صلاح الدین ایوبیؒ نے پائے تکمیل تک پہنچایا۔ غازی صلاح الدین ایوبیؒ نے ایک طرف تو ۵۶۷ھ میں سازشی شیعہ حکومت (عبیدی فاطمی) کو ختم کرکے خلافت بنو عباس میں شامل کر دیا اور دوسری طرف ۵۸۳ھ میں قبلۂ اوّل بیت المقدس

کو یہودی و عیسائی قبضہ سے پاک کر دیا۔ مختصراً یہ کہ عظیم مردِ مجاہد غازی صلاح الدین ایوبی رح نے مختصر مدت میں یہ عظیم تاریخی کارنامہ انجام دیا کہ شیعیت، یہودیت اور عیسائیت کے طاغوتی تگڈم کو ایک ساتھ پاش پاش کر دیا اور مرکزِ اسلام اہلِ اسلام اور مقدس مقاماتِ اسلام کو اغیار کی دستبرد سے محفوظ کر دیا۔ اس غازیٔ اسلام (متوفی ۵۸۹ھ) نے سرکشوں کے کس بل نکال کر ایسا سرنگوں کیا کہ برسوں بعد تک ان مخالفینِ اسلام کی کمر ٹوٹی رہی۔

(۱۰) خلافتِ بنو عباس ۶۵۰ھ تک پوری دنیا میں علمی، سیاسی اور عسکری لحاظ سے عروج پر پہنچ چکی تھی جسے منافقین بھلا کب برداشت کر سکتے تھے۔ لہٰذا دنیا کی قوی ترین مسلم خلافت کو تباہ کرنے کی خاطر اہلِ تشیع کے دو شاطر دماغ ابن علقمی اور نصیر طوسی نے اسلام کے بدترین دشمن تاتاریوں کے سردار ہلاکو خاں سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ اس تخریبی چال کے نتیجہ میں خونخوار ہلاکو خاں پوری شیعہ قوم کی مدد سے ۶۵۶ھ میں خلافتِ عباسیہ پر حملہ آور ہوا۔ اس طرح "شیعہ ہلاکو" ملی بھگت نے لاکھوں مسلمانوں کا قتلِ عام کیا، خلیفہ مستعصم باللہ کو ذبح کیا، دینی و علمی مراکز کو خاکستر کیا اور دنیا کی عظیم ترین خلافتِ عباسیہ کو تہس نہس کر دیا۔

مختصراً یہ کہ وہ تابناک مسلم تہذیب و تمدن، مسلم مرکزیت اور اسلامی خلافت جو اپنے نقطۂ عروج پر تھی اہلِ تشیع کے ہاتھوں نیست و نابود ہو گئی۔

(۱۱) زوالِ خلافتِ عباسیہ (۶۵۶ھ) کے طلد ہی بعد مسلم مرکزیت کا احیاء ۶۸۷ھ میں ہو گیا جب خلافتِ عثمانیہ وجود میں آئی۔ عالمی سطح پر خلافتِ عثمانیہ تقریباً سات سو سال کے طویل عرصہ تک قائم رہی۔ حالانکہ یہ مرکزی مملکتِ اسلامیہ ان سات صدیوں میں بیک وقت تین براعظموں یعنی یورپ، ایشیا اور افریقہ پر چھائی رہی۔ اور اس کے زیرِ اثر دنیا کے تمام اہم بحر و بر رہے، پھر بھی یہ مستحکم خلافت مسلسل اغیار کے نرغے میں زک اٹھاتی رہی۔ بالخصوص ایران کی تمام شیعہ حکومتیں یعنی صفوی، قاچاری، اور پہلوی حکومتیں یکے بعد دیگرے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف نہ صرف گوناگوں ریشہ دوانیوں اور چیرہ دستیوں میں شامل رہیں، بلکہ باقاعدہ محاذ آرائیاں اور جنگی کاروائیاں بھی کرتی رہیں۔ آخر میں دشمنانِ اسلام نے ترپ کا پتا استعمال

کیا۔ اور داخلی بغاوت کے ذریعہ نہ صرف عالمی خلافت کو غارت کر دیا بلکہ دنیا سے خلافت کا نام و نشان بھی غائب کر دیا۔

۱۳۴۲ھ یعنی ۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانیہ کی قانوناً تنسیخ کر دی گئی جس کی وجہ سے تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ رونما ہوا کہ مسلمانوں کا مرکزی ادارۂ خلافت صفحۂ دنیا سے پہلی مرتبہ مٹا دیا گیا۔

(۱۲) صدیوں پر محیط مرکزی خلافت کے ساتھ ساتھ دنیائے اسلام کا دوسرا دفاعی مورچہ ہمیشہ برِصغیر جنوبی ایشیا رہا۔ اِس قلعۂ اسلام میں بھی رخنے ڈالنے اور یہاں بھی غلبۂ اسلام کو غتر بود کرنے کے لیے شیعہ منافقین اپنے کرتوت اور کارستانیوں میں لگاتار لگے رہے۔ اختصار کی خاطر اتنا اشارہ کافی ہے کہ اِس خطۂ مسلم پر بھی بیرونی اور اندرونی دونوں طرح کی یلغار جاری رہیں۔ مثلاً اگر بیرونی طور پر نادر شاہ ایرانی اور تیمور لنگ جیسے غارتگر یورشیں کرتے رہے تو اندرونی طور پر میر جعفر اور میر صادق جیسے غدار شبخوں مارتے رہے۔ (بقول شاعر: جعفر از بنگال و صادق از دکن۔ ننگِ ملت، ننگِ دیں ننگِ وطن)۔ بہرکیف برِصغیر جنوبی ایشیا میں بھی صدیوں کا خلیۂ اسلام شیعوں کی شیطنت کا نذر ہو گیا اور ۱۸۵۷ء میں اغیار کے ہاتھوں مغلوب ہو گیا۔ اس کے بعد جب مذکورہ بالا سانحہ رونما عثمانیہ (۱۹۲۴ء) بھی رونما ہو گیا تو اس دوہرے حادثہ نے متحد مسلمانانِ عالم کو منتشر و متفرق کر کے رکھ دیا۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے خلافتِ عثمانیہ کے زیرِ اثر برِصغیر کی مسلم حکومت زیر کی گئی اور پھر خاتمۂ خلافت کے ذریعہ دنیا کی بقیہ مسلم حکمرانی کئی ٹکڑیوں میں بانٹ دی گئی۔

اسرائیل کی ناجائز ولادت اور سیاسی سازشوں کا نیا دور

(۱) اگرچہ (۱۹۲۴ء) میں عالمِ اسلام کا مرکزی ادارۂ خلافت مسمار کیا جا چکا تھا اور اہلِ اسلام چھوٹے چھوٹے علاقوں، خطوں اور ملکوں میں تقسیم کیے جا چکے تھے، پھر بھی یہود اور آلِ یہود اپنی سیاسی بساط شطرنج پر اُن بکھرے ہوئے مسلمانوں کو اردب میں لینے اور مکمل مات دینے میں مصروف رہے۔ اس سازشی پس منظر کے باوجود ۱۹۴۷ء میں دنیا کے نقشہ پر وقت کا سب سے بڑا مسلم ملک پاکستان نمودار ہو گیا۔ چنانچہ پوری عالمی یہودیت حرکت میں آ گئی اور اس کے دونوں عالمی مہروں یعنی امریکہ اور روس

حرمین شریفین کی حرمت

بار بار پامال کرنے والے اہلِ تشیع

تاریخ کے آئینہ میں

(ابوارقم انصاری)

حرمین پاک میں حالیہ واردا توں کا ناپاک سلسلہ

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن مجید کے مطابق حرمین مقدس کی بے حرمتی بھی حرام ہے اور خونِ مسلم بھی حرام ہے۔ اس وجہ سے ان دونوں حرمتوں کی پامالی کا سنگین جرم اور وہ بھی بیک وقت و یکجا، اس کا کوئی مسلمان ارتکاب تو کیا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایسی بنیادی حقیقت کے باوجود ۶ ذوالحجہ ۱۴۰۷ھ — (۳۱ جولائی ۱۹۸۷ء) کو ایک مرتبہ پھر ایرانی قیادت میں اہلِ تشیع نے حرم کعبہ و مسجد الحرام کی حرمت کو بھی پامال کیا۔ اور اہلِ حرم و مہمانانِ حرم کا خون بھی کیا۔ پھر یہ کہ یہ دونوں حرام کام نہ صرف بیک وقت کیے گئے بلکہ عین ایامِ حرام میں انجام دیئے گئے۔

حرمین پاک کی توہین و تذلیل کا یہ سلسلہ ناپاک ۷۹ء سے ہر سال بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ پچھلے سال تو خمینی کے ایرانی کارندوں نے سارے حرمین شریفین کو بارود سے اڑانے کی بھی جسارت کر ڈالی تھی۔ پچھلے سال ۳ ذوالحجہ ۱۴۰۶ھ (۷ اگست ۸۶ء) کو ایرانی تخریب کار اکیاون کلو

ملک کا سربراہ بن بیٹھا جس نے صرف تین سال (۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۸ء) کی مختصر مدت میں پاکستان پر چار ضرب کاری لگا دیئے۔ اوّلاً یہ کہ پاکستانی صوبہ بلوچستان کی ریاست قلات کے خلاف جارحانہ اقدام کیا۔ کیونکہ وہاں عرصہ دراز سے شرعی قوانین نافذ تھے۔ دوسرے یہ کہ اُسی پاکستانی صوبہ بلوچستان (ملحقہ ایران) کا ایک بڑا سرحدی رقبہ جو تیل کی دولت سے مالا مال تھا، ایران کے حوالے کر دیا۔ تیسرے یہ کہ پاکستان کا اسلامی آئین ۱۹۵۶ء منسوخ کر ڈالا اور چوتھے یہ کہ ایرانی النسل نصرت بھٹو کے شوہر ذوالفقار علی بھٹو کو وزیر بنا دیا جس نے آگے چل کر دوسرے شیعہ سربراہ مملکت آغا یحییٰ کے مشن کو مکمل کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا اور ۱۹۷۱ء میں بالآخر پاکستان کو ان دونوں نے دو ٹکڑے کر ڈالا۔ چونکہ اُس وقت کی سب سے بڑی اسلامی مملکت نہ صرف سارے اسلامیانِ عالم کے لیے مضبوط دفاعی ڈھال اور دینِ اسلام کے لیے مضبوط قلعہ کا درجہ رکھتی تھی بلکہ حرمین شریفین کے لیے بھی حفاظتی حصار کا مقام رکھتی تھی، لہٰذا دشمنانِ اسلام نے اسکیم یہ بنائی کہ پاکستان کو اندرونی خانہ جنگی اور بیرونی حملے کا بیک وقت نشانہ بنایا جائے تاکہ چکی کے ان دو پاٹوں کے درمیان اسے پیس دیا جائے۔ ۱۹۷۱ء میں یہی کچھ ہوا۔

آغا یحییٰ اور ذوالفقار علی بھٹو نے مل کر پاکستان اکثریت کے منتخب کردہ نمائندے مجیب الرحمٰن کو اقتدار سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس ظلم و زیادتی کے خلاف حسبِ توقع مجیب الرحمان کے ساتھ انتخاب مشرقی پاکستان میں زبردست سیاسی احتجاج شروع ہو گیا اور طے شدہ پروگرام کے مطابق یحییٰ اور بھٹو نے وہاں فوجی کاروائی کے ذریعہ نہ صرف خانہ جنگی بپا کر دی بلکہ ہندوستان کو بھی بالواسطہ دعوت دے دی کہ وہ حرکت میں آجائے اور موقع سے فائدہ اٹھا کر حملہ کر دے۔ جواباً ہندوستان نے وہی کیا اور مشرقی پاکستان کو یکدم مغربی پاکستان سے کاٹ کر جدا کر دیا۔ بالآخر ایک ہی تیر سے دو شکار کر لیے گئے۔ پاکستان آدھا کر دیا گیا اور بچا کھچا مغربی پاکستان (ملحقہ ایران) آئندہ ایران کے لیے ایک لقمۂ تر بنا دیا گیا۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ یحییٰ نے بچے کھچے پاکستان کا اقتدار ناجائز طور پر بھٹو کے حوالے کر دیا اور بھٹو نے اعلان کیا کہ "نئے پاکستان" کا بڑا بھائی ایران ہے۔ بعد ازاں شاہ ایران کے اشارے پر بھٹو نے پاکستانی صوبہ بلوچستان (ملحقہ ایران) میں فوجی کاروائی کی تاکہ وہاں ایران موقع نکال کر

قبضہ جمالے، مگر بلوچی مسلمانوں نے اس شیعہ سازش کو ناکام بنا دیا۔ پھر ۱۹۷۷ء میں پوری پاکستانی قوم نے بھٹو کو اٹھا کر باہر پھینک دیا اور مخلص مسلمان جنرل ضیاالحق کو موقع فراہم کیا کہ وہ اصلاحِ احوال کر سکیں۔ جب ۱۹۷۷ء سے صدر ضیاالحق نے ٹوٹے پھوٹے پاکستان کی اسلامی بنیادوں پر تعمیرِ نو شروع کی، تب سے ہی یہود اور آلِ یہود (اہل تشیع) نے آج ۱۹۸۸ء تک واویلا مچایا ہوا ہے۔ ایک ہدف تو یہ ہے کہ پاکستان کا اسلامی تشخص مٹا کر اسے پانچ قومیتوں میں تقسیم کر دیا جائے اور دوسرا محاذ یہ ہے کہ پاکستان کی مادی و دفاعی قوت کو مفلوج کر دیا جائے۔ مثلاً ایک طرف تو شیعہ شاطر رئیس امروہوی کی غدارانہ آواز کہ "پنجتن کی قسم پاکستان میں پانچ قومیتیں ہیں۔" (جنگ، کراچی ۵ ستمبر ۱۹۸۶ء) نے پوری تحریک کھڑی کر دی تو دوسری طرف شیعہ صحافی مشاہد حسین نے پاکستان کے جوہری اور ایٹمی توانائی پروگرام کو سبوتاژ کرنے کے لئے مارچ ۱۹۸۷ء میں عالمی اسکینڈل کھڑا کر دیا تاکہ کچلے ہوئے پاکستان کا مزید کچومر نکال دیا جائے۔ المختصر، پاکستان کے خلاف روزِ اوّل سے سازش یہ جاری ہے کہ اس عظیم مسلم ملک کو دنیا کے اہل اسلام اور مرکزِ اسلام (حرمین شریفین) کا محافظ بننے سے بہر صورت باز رکھا جائے۔

جدید ایران و اسرائیل کا یکساں وحتمی ہدف ـــــ حرمین شریفین

سطور بالا میں پچھلی چودہ صدیوں کا جو مختصر تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے، وہ یہودیت اور شیعیت کے بنیادی حقائق کو بیک نظر واضح کر دیتا ہے۔ اولاً یہ کہ مذہبِ شیعہ کا بانی مبانی ابن سبا یہودی تھا۔ دوسرے یہ کہ ابن سبا کے ناطے شیعیت نسلاً اور اصلاً وہی یہودیت ہی ہے، تیسرے یہ کہ اس رشتے سے یہود اور آلِ یہود (اہل تشیع) دونوں ہی اسلام کے خلاف گزشتہ چودہ صدیوں سے مسلسل تخریب کاری کرتے رہے ہیں اور چوتھے یہ کہ اسی دیرینہ نسبت سے نہ صرف شیعیت اور یہودیت کا نصب العین ایک ہے بلکہ عصرِ حاضر کے ایران اور روز افزوں اسرائیل کا حتمی ہدف بھی یکساں ہے۔ البتہ جب وہ عالمی خلافتِ عثمانیہ جو دنیا کی سپر پاور بھی تھی اور دنیا کے تمام مسلمانوں کا سیاسی مرکز و محور بھی تھی، درہم برہم کر دی گئی، اس کے بعد ہی یہود اور آلِ یہود نے اپنا حتمی ہدف مسلمانوں کا "روحانی مرکز" بنایا۔ اسی غرض سے نئی حکمتِ عملی کے تحت پہلے مرحلے میں اسرائیل نے جنم لیا، دوسرے مرحلے میں اسرائیل نے ایران کی بالواسطہ اعانت سے مسلمانوں کے قبلۂ اوّل (بیت المقدس) پر قبضہ کیا اور پھر تیسرے اور آخری مرحلے میں

یہ دونوں ممالک مرکز اسلام یعنی حرمین شریفین پر تسلط کے لئے ہر ابلیسی حربہ استعمال کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں ولادت اسرائیل کے موقع پر ہی اسرائیلی وزیر اعظم بن گوریان نے اعلان کر دیا تھا کہ یہودی حکومت ان تمام مسلم علاقوں پر قبضہ کرے گی جہاں سے یہودی نکالے گئے تھے۔ اسی لئے اسرائیلی پارلیمنٹ بلڈنگ پر جو "وسیع تر اسرائیل" کا نقشہ آویزاں ہے، اس کی حدود میں حرمین مقدس شامل ہیں۔ ٹھیک اسی یہودی نقشہ پر ایرانی سربراہ خمینی عرصہ دراز سے گامزن ہے، جس کے شواہد درج ذیل ہیں:۔

(۱) خمینی نے ایران کی سربراہی (۱۹۷۹ء) سے برسوں پہلے ایک نہایت معنی خیز کتاب "کشف الاسرار" لکھی تھی جس میں اُس نے گیارہویں صدی ہجری کے شیعہ پیشوا باقر مجلسی کی تحریر "حق الیقین" کو بہت نمایاں کیا تھا اور باقر مجلسی کی زبانی خمینی نے بالواسطہ یہ دعویٰ کیا تھا کہ:۔

(الف) جب "صاحب الامر" اپنے منصب پر فائز ہو جائیں گے تو سب سے پہلے مکہ معظمہ پر قبضہ کریں گے۔

(ب) پھر وہ صاحب الامر مدینہ منورہ جا کر پہلے محمدؐ سے بیعت لیں گے، پھر ابوبکرؓ اور عمرؓ کو قبروں سے نکال کر زندہ کریں گے اور سولی پر چڑھائیں گے۔

(ج) پھر عائشہؓ کو زندہ کر کے سزا دیں گے اور آخر میں تمام سنیوں (مسلمانوں) خصوصاً علماء کو قتل کر نیست و نابود کر دیں گے۔

(بحوالہ "حق الیقین"۔ صفحات ۱۳۹، ۱۴۵، ۵۲۷)

(۲) خمینی نے اپنی حکومت قائم کرنے سے کچھ ہی عرصہ پہلے اپنا ابلیسی منصوبہ براہ راست بھی منکشف کر دیا تھا اور کہا تھا کہ،

"دنیا میں ہماری قوت اس وقت تک تسلیم نہیں ہو سکتی جب تک مکہ اور مدینہ پر ہمارا قبضہ نہیں ہو جاتا اور چونکہ یہ علاقہ مہبط الوحی اور مرکز اسلام ہے اس لئے اس پر ہمارا تسلط ضروری ہے اور میں جب فاتح بن کر مکہ اور مدینہ میں داخل ہوں گا تو روضۂ رسولؐ میں پڑے ہوئے دو بتوں یعنی ابوبکرؓ اور عمرؓ کو نکال باہر کروں گا۔" (بحوالہ خمینی ازم اور اسلام۔ صفحہ ۸، مولفہ ابو ریحان فاروقی)

(۳) خمینی نے ۱۹۸۰ء میں اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد پوسٹروں اور بینروں کے ذریعہ اپنے جس پلان کی تشہیر کرائی اس کی عبارت یہ تھی کہ "ہم جنگ آزما ہوں یہاں تک کہ غاصبوں کے قبضے سے اپنی مقدس زمینیں (یعنی عراق کربلا اور سعودی مدینہ منورہ) اور خانہ کعبہ اور جولان واپس لیں گے"۔

(بحوالہ ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ، اگست ۱۹۸۰ء صفحہ ۱۱)

(۴) ایرانی اقتدار فروری ۱۹۷۹ء میں خمینی کے ہاتھ آیا اور صرف ۹ ماہ بعد ہی ایک مسلح گروہ نے حرم کعبہ پر نومبر ۱۹۷۹ء میں حملہ کیا، سینکڑوں مسلمانوں کو ہلاک کیا اور دو ہفتوں سے زیادہ حرم بیت اللہ پر قبضہ جمائے رکھا، تاہم ناپاک قبضہ ناکام ہو کر رہا۔

(۵) اس کے بعد ہر سال عین حج کے دوران خمینی کے کارندے حدود حرمین میں ہنگامے کر کے حرمت حرمین پامال کرتے رہے۔ مرکز امن کو پراگندہ کرنے کا یہ شیطانی دھندہ موجودہ سال ۱۹۸۷ء تک لگاتار چلتا رہا، حالانکہ پچھلے سال ہی حرمین کو آتشیں بموں سے اڑا دینے کی سازش پکڑی جا چکی تھی (تفصیل اوپر ابتدائیہ میں مذکور رہے) اس کے باوجود امسال ۱۹۸۷ء کے حج کے لئے خمینی نے اپنی آل اولاد کو یہ ہدایات دیں کہ،

"حج کو کافروں سے اظہار برأت (تبرا) کے لئے استعمال کریں اور ایام حج میں زبردست مظاہروں کا فریضہ انجام دیں، اور یہ کہ یہ حج بالکل فیصلہ کن اور کچل دینے والا (CRUSHING) حج ہونا چاہیئے"۔ (بحوالہ "امپیکٹ انٹرنیشنل" لندن ہم تا ۲۷ راگست ۱۹۸۷ء)

ان ہی ہدایات کے مطابق ۳۱ رجولائی ۱۹۸۷ء کو جو مسلح جلوس حرم کعبہ کے اطراف مارچ کر رہا تھا، اس کے بینروں پر صاف لکھا ہوا تھا کہ "لبیک یا خمینی" اور " اپنے آپ کو مسلح کرو اور ہتھیار اٹھالو"۔ اس کے ساتھ ہی اس مسلح ٹولے نے وہ خونخواری و خونریزی بپا کی جس کی تفصیل منظر عام پر آچکی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ عصر جدید میں اسرائیل اور ایران دونوں کا حتمی ہدف مسلمانوں کا "روحانی مرکز" ہے۔ لہٰذا حرمین کو تاخت و تاراج کرنے اور اس سرزمین مقدس پر قبضہ کرنے کے لئے آجکل حکمت عملی یہ ہے کہ ہراول دستہ تو ایران کا ہو اور اس کو کمک اسرائیل ہم پہنچاتا رہے۔

حاصل کلام:- آج سانحہ حرم کے حوالے سے یہود اور آل یہود (اہل تشیع) کی پچھلی چودہ صدیوں

سے جاری اسلام دشمنی طشت از بام ہو چکی ہے اور قرنِ اوّل کے ابنِ سبا یہودی (بابائے شیعیت) سے لے کر دورِ حاضر کے خمینی تک تمام چہرے تاریخ کے آئینے میں بالکل بے نقاب ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اب آخری موقع ہے کہ مسلمانانِ عالم خوابِ غفلت سے بیدار ہوں اور اپنی بقا اور اپنے مرکز حرمین شریفین کی حفاظت کے لئے کم از کم ان آستین کے سانپوں کی بلا تاخیر اور مکمل سرکوبی کر دیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے!

تاثراتِ سعادتِ عمرہ

گذشتہ ماہ عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ حسبِ سابق سفرنامہ تو نہ لکھا جا سکا مگر تاثرات لکھے بغیر رہا بھی نہ جا سکا۔ سو حاصلِ سفر یہ چند حروف ہیں۔

حُسنِ ظاہر سے تیرے روشن جہانِ رنگ و بُو
پر جمالِ باطنی کی ضُو فشانی اور ہے!

دیکھتی ہے آنکھ گنبد کو در کو کبھی
دِل نے جو دیکھا ہے آقا وہ کہانی اور ہے

بہتے ہیں دریا بہت شوریدہ سر موجیں بھی ہیں
بحرِ رحمت کی تیرے لیکن روانی اور ہے

چاہنے والوں سے چُھپتا ہے وطیرہ حُسن کا
گھر پہ تیرے عاشقوں کی میزبانی اور ہے

تیری طاعت میں ہے لُطفِ زندگی بیشک فقیر
کیف آگیں لذّتِ دردِ نہانی اور ہے

(ایک قاریہ)

لمحۂ فکریہ

بی اے کا امتحان پاس کرتے ہی دوستوں کے کہنے پر ایک پرائیویٹ کالج جوائن کر لیا تاکہ مل بیٹھنے کا بہانہ بن سکے۔ بچوں کو تعلیم بھی دینا ہے۔ اس قسم کا کوئی مقصد لے کر ہم وہاں نہیں گئے تھے اور بیشتر تعلیمی اداروں میں اساتذہ کی اکثریت جی بہلانے ہی جاتی ہے اور اس پرائیویٹ کالج میں دوستوں کے علاوہ ایک دو کلاس فیلوز بھی "استادی" کے فرائض سرانجام دے رہی تھیں۔ لہٰذا ہم خوش تھے کہ زمانۂ طالبعلمی کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ تین چار ماہ ہی گذرے ہوں گے ربیع الاوّل کا مہینہ آگیا۔ ۱۱ ربیع الاوّل کو ہم اپنے سٹوڈنٹس سے بھی زیادہ خوش تھے کہ کل چھٹی ہے (چھٹی کی خوشی ہمیں عموماً اپنے طالبعلموں سے زیادہ ہوا کرتی ہے) ایسے ہی بیٹھے بیٹھے By The Way بچوں سے پوچھ لیا ۱۲ ربیع الاوّل کو کیا ہوا تھا؟ ہم نے دیکھا پوری جماعت میں صرف ایک ہاتھ کھڑا ہے۔ یہ پہلا دھچکہ تھا جو زمانۂ تدریس میں ہمیں پہنچا۔ مذہب سے دور تو ہم بھی بہت تھے مگر حالات اس حد تک سنگین ہو سکتے ہیں، ہم نے سوچا بھی نہ تھا۔ اس کے بعد میں ایک ایک جماعت میں گئی اور اپنے قارئین کے لئے بتا دوں کہ کالج کی سینئر کلاس میں ۲۴ میں سے فقط چھ طالب علموں کو اس سوال کا جواب آتا تھا۔ پھر جانے کیا سوجھی کہ میں دوسری کلاس میں جا نکلی اور ننھے ننھے بچوں سے یہی سوال کیا۔ جواباً جماعت میں سناٹا چھاتے دیکھا تو میں نے پوچھا "بچو! ریکھا کا پتا ہے، ریکھا کون ہے؟" شرمیلی مسکراہٹوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے ہاتھ کھڑے ہوئے اور ایک نسبتاً چھوٹا سا سانولا سا بچہ کھڑا ہو کر بولا، "مس! انڈیا کی ایکٹرس ہے"۔

محترم قارئین! ممکن ہے آپ اس بات پہ مسکرا دیں اور اس کے بعد میری تحریر ختم ہوتے ہی یہ بات

آپ کے ذہنوں سے محو ہو جائے۔ مگر صاحب! ٹھہریئے ——— ایک لمحہ کے لئے سوچئے کیا یہ لمحۂ فکریہ نہیں ہے؟ ہم آنے والے ننھے اور معصوم ذہنوں کو کیا دے رہے ہیں؟ ہماری آنے والی نسلوں کا اندازِ فکر کیا ہو گا؟ بلکہ یہ سب جاننے کے لئے ہمیں کچھ زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی پچھلے دلوں کے عالمی کرکٹ کپ کے مقابلے تو ہم سب کو یاد ہیں۔ سیمی فائنل ہارنے کے بعد ہم سب کا کیا حال تھا؟ سٹیڈیم میں موجود کتنے لوگوں کے آنسو بہے تھے۔ گھروں میں میچ سننے اور دیکھنے والوں کے دلوں کی گہرائیوں سے کتنی آہیں نکلی تھیں؟ اور میچ کے آخری لمحوں میں کتنے سر سجدہ ریز تھے؟ یہ یاد کرنے کے لئے ہمیں ذہن پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن عزیز قاری! کیا کراچی کے حادثات پر بھی ہماری یہی حالت ہوئی تھی؟ ہمارے نوجوان اسی طرح بے ہوش ہو کر ہسپتالوں میں پہنچے تھے؟ کیا فلسطین میں مسلمانوں کے تڑپتے ہوئے لاشے دیکھ کر بھی ہماری قوم کی آنکھ سے آنسو ٹپکتے ہیں؟ کسی ایک آنکھ کا کوئی ایک آنسو؟ کسی ایک چہرے پہ اداسی؟ کسی ایک دردمند دل سے آہ؟ اس لئے کہ ہم نے اپنے نوجوانوں کو دو طرح آئیڈیل ہی دیئے ہیں۔ ایکٹر یا کھلاڑی،

ہمارے پبلسٹی کرنے والے ادارے بھی اسی خبر کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں جو فلم انڈسٹری کے متعلق ہو یا کھیل کے میدان کے بارے ہیں۔ وہ دَور اور تھا جب بڑے ہو کر کیا بنو گے؟ کے جواب میں بچے ڈاکٹر یا انجینئر کا لفظ بولا کرتے تھے۔ آجکل انہیں عمران خاں، جاوید میاں داد اور مائیکل جیکسن کے علاوہ اور کچھ نہیں سوجھتا۔ طالبعلموں کی کلاس ورک کی کاپیاں ہوں یا امتحانی گتّے، سکول کے بستے ہوں یا کمرے کی دیواریں ان پہ کھلاڑیوں کی تصویریں ہوں گی یا ایکٹرز کی۔ ٹیپو سلطان محمد بن قاسم، صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی اور خالد بن ولید جیسی ہستیوں کو کوئی نہیں جانتا۔ ہماری نئی نسل کو یہ فکر نہیں ہے کہ ہمسایہ ملک نے کتنا اسلحہ جمع کر لیا ہے، انہیں یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ انڈیا کی نئی فلم شہنشاہ کب قریبی وڈیو سنٹر سے ملے گی؟ وہ یہ بھول گئے ہیں کہ تقسیم ہند کس طرح کی گئی فقط یہ یاد رہ گیا ہے کہ لیڈی ڈائنا کے تعلقات شہزادہ چارلس سے کب خراب ہونا شروع ہوئے تھے؟ انہیں یہ علم نہیں کہ مشرقی پاکستان کیسے الگ ہوا؟ یہ معلوم ہے کہ سنیل گواسکر کیسے کرکٹر بنا؟

ممکن ہے آپ سوچ رہے ہوں کہ میں لکھتے لکھتے جذباتی ہوگئی ہوں، ہاں آپ یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں۔ اب ہم قوم یا وطن کے دکھ میں آہ بھرنے کو جذباتی پن ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس جذباتی پن کو دور کرتے کرتے کچھ ہی عرصہ بعد ہم سب کس حال میں ہوں گے؟ یہ سوچنے کے لئے بھی تھوڑے سے مزید جذباتی پن کی ضرورت ہے۔

مجھے اپنی ایک پروفیسر صاحبہ یاد آرہی ہیں۔ ایم اے تک تعلیم پانے کے بعد کالج میں تعلیم دینے کے فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ ایک دفعہ ان کی ساس صاحبہ چند روز رہنے کے لئے ان کے ہاں آئیں۔ نماز کا وقت ہوا، بڑی بی نماز کے لئے قبلہ رُو ہوئیں تو تمام پوتے پوتیاں حیران پریشان گرد کھڑے ہوگئے۔ استاد ماں کے کمرے میں داخل ہونے پہ بچوں نے پوچھا مما! یہ گرینڈ ما کیا کر رہی ہیں؟ استاد صاحبہ سے کچھ نہ بن پڑا کہ بچوں کو نماز کا بتاؤں گی تو اگلا سوال ہوگا، مما! نماز کیا ہوتی ہے؟ فرمادیا، بیٹے ورزش کر رہی ہیں۔

اسی ماں کے بیٹے کی انگلی جل جائے تو یہ علاج کے لئے لندن جانے کو تیار ہوگی اور یہ نہیں جانتی کہ وہ تو سالم بیٹا بڑھکتی آگ کے حوالے کیئے جا رہی ہے، وہ آگ جس کے متعلق فرمادیا گیا ہے کہ تم نہیں جانتے وہ بڑھکتی ہوئی آگ کیا ہے؟

ماں بچے کو فجر کی نماز کے لئے نہیں اٹھاتی کہ ننھی جان گہری نیند اور سردی میں وضو کی تکلیف اٹھائے گی اور یہ بھول گئی ہے کہ اس کا یہی پیار، اس کی یہی محبت بچے کے لئے ہولناک عذاب خرید رہی ہے۔ پچھلے دنوں ایک محترمہ ملیں، فرمانے لگیں کیا کریں بچے کنڈی لگا کر سو جاتے ہیں کیونکر جگایا جائے۔ عرض کی محترمہ! اگر آپ کو یہ علم ہو کہ بچہ کنڈی چڑھا کر زہر کھانے لگا ہے تو آپ دروازہ توڑ کر اسے بچانے کمرے میں جا گھسیں گی یا نہیں۔

پچھلے ہی مہینے کی بات ہے۔ میں نے ساتویں کلاس کے کمرے میں روضۂ رسولؐ کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا، بچے! یہ کس کی تصویر ہے؟ جواب میں فقط صرف ایک ہاتھ کھڑا ہوا اور اس نے بھی وضاحت یہ کی کہ یہ مدینہ میں ایک مسجد ہے، ممکن ہے آپ سمجھے ہوں اس بات میں کچھ مبالغہ ہے۔ صاحب! کاش کہ یہ مبالغہ ہی ہوتا۔

قارئین کرام! اس وقت میرا قلم اٹھانے کا یہ مقصد ہے کہ آئیے سوچیئے، نئی نسل کے رجحانات کو غلط سمت دکھانے میں قصور کس کا ہے؟ کیا ان کی راہیں بدلنے میں ہم سب برابر کے شریک نہیں ہیں؟

ہم لوگ آنکھ کھولتے ہی اُسے وی سی آر دکھاتے ہیں ہوش سنبھالتا ہے تو Brother Come and Dance with me جیسی انگریزی نظمیں رٹوانے کی فکر سر پہ سوار ہو جاتی ہے۔ شعور کی پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتا ہے تو تشریح کرواتے ہیں:۔

چل بھی دیے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا کیا ہے

اور جب یہ کچے ذہن کالج کے پُرفضا ماحول میں پہنچتے ہیں تو سب سے پہلا درس لازمی مضمون کے اساتذہ سے ملتا ہے، ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا

تو صاحب! پھر اگر یہ نوجوان سڑکوں پہ گریباں چاک نظر آئیں تو شکایت کیسی؟ حیرت ہے پڑھایا بھی، سکھایا بھی، دکھایا بھی اور پھر لگادی پابندی، یہ کہاں کا انصاف ہے؟۔

اور رہ گیا خدا تو اس کی حیثیت ہمارے نزدیک ایک تنخواہ دار ملازم سے زیادہ نہیں ہے۔ مصیبت پڑی، نمازیں پڑھیں، نوافل ادا ہوئے۔ مصیبت ٹلی تو عبادات کی رشوت دینا بھی بند کر دی اور اگر خرابیٔ قسمت سے مصیبت نے ٹلنے کا نام ہی نہ لیا تو اس کی ذات سے انکاری ہو گئے اور شکوہ یہ کہ اتنی عبادات اور دعاؤں کے بعد بھی تمنا پوری نہیں کی، یہ کیسا خدا ہے؟ بالکل جس طرح ہم تنخواہ دار ملازم پہ برس پڑتے ہیں کہ پیسے لے کر بھی کام نہیں کیا کیسے ملازم ہو؟۔

تیری رحمت کی تمنا تیری چاہت سے گریز
رابطے ذرا دیکھ اپنے گنہگاروں کے

مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک نوجوان جوڑا کشتی پہ دریا کی سیر کر رہا تھا، اچانک طوفان آگیا، لڑکے نے چپو چھوڑ کر ہاتھ بلند کر دیئے اور گڑگڑانے لگا "اے میرے اللہ! تو ہمیں بچالے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی سگریٹ نہیں پیوں گا، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی شراب نہیں پیوں گا، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی . . . ٹھہرو! لڑکی تیزی سے بولی، "سوچ سمجھ کر وعدہ کرنا، طوفان تھمنے کے آثار ہیں۔"

ہم لوگوں نے اپنی نئی نسل کو کیا دیا ہے؟ یہ جاننے کے لئے زیادہ تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ روضۂ رسولؐ اور عمران خاں کی تصویر ایک ساتھ رکھ کر قوم کے کسی بھی نونہال کو بُلا لیجئے، وہ کس کی طرف لپکے گا؟ اشفاق احمد کے ڈرامے اور سری دیوی کی فلم کی وڈیو کیسٹ رکھ کر دیکھئے اس کے ہاتھ سری دیوی کی فلم کی طرف ہی بڑھیں گے۔ جاسوسی

ناول اور داتا گنج بخش ؒ کی کشف المحجوب دکھا کر دیکھیے وہ کشف المحجوب کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھائے گا۔ اس لئے کہ ہم آنکھ کھولتے ہی اسے سناتے ہیں ؎

"اس ریشمی پازیب کے صدقے"
"لک ہلے مزاجن جاندی دا"

ایسے میں

"محروم تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے"

کی سمجھ کیسے آئے گی؟ اس لئے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ ہمارے تعلیمی اداروں، ہمارے نظامِ تعلیم نے کوئی واضح مقصد اپنے سامنے نہیں رکھا۔ ذرائع ابلاغ کی مجبوری ہے کہ پبلک کی ڈیمانڈ یہی ہے۔ نوجوان رسالہ ہی وہ خریدتے ہیں کہ جس میں پسندیدہ اداکار یا دل پسند کھلاڑی کا انٹرویو ہو۔ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ اس شعبہ نے لفظ 'ہیرو' کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ یہ لفظ اب کسی مجاہد، غازی یا شہید کے ساتھ لگانے کو جی نہیں چاہتا۔ انہوں نے 'محبت' کا ایسا نظریہ پیش کیا ہے کہ باپ اور بھائی کے سامنے یہ لفظ بولتے شرم آتی ہے۔ ایک دفعہ ایک خاتون نے لکھا تھا۔ 'میں نے اپنے سات سالہ بچے سے لفظ محبت جملے میں استعمال کرنے کو کہا تو وہ بولا، مما! مجھے شرم آتی ہے۔ اس شعبے نے اپنی فلموں، ڈراموں اور افسانوں کے ذریعے ایک کام کیا ہے۔ بچوں کو اپنے والدین سے زیادہ سمجھ دار بنا دیا ہے۔ اس بات کا اندازہ اس لطیفے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

"ایک صاحب نے کہیں پڑھا کہ چھوٹے بچوں کو ان کے نئے آنے والے بہن بھائیوں کے لئے پہلے ہی سے ذہنی طور پر تیار کر دینا چاہیئے اس طرح وہ ان کی آمد پہ اُلجھتے نہیں اور نہ ہی ان سے چڑتے یا حسد کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تین سالہ بچے کو پیار سے اپنے پاس بلایا اور بڑی محبت سے کہنے لگے، 'بیٹے آپ اکیلے تھے نا، ہم نے اللہ میاں سے دعا مانگی ہے کہ وہ آپ کو ایک پیارا سا بھائی یا بہن بھیج دیں تاکہ آپ اس کے ساتھ کھیل سکیں۔ اللہ میاں نے ہماری دعا قبول کر لی ہے اور اب کچھ ہی دنوں بعد ہمارے گھر ایک ہیلی کاپٹر آئے گا۔ اس میں ایک بہت پیاری پھولوں کی ٹوکری ہو گی جس میں ایک خوبصورت اور ننھا سا بچہ سویا ہو گا۔ ہم ہیلی کاپٹر سے وہ ٹوکری لے لیں گے۔ ٹھیک ہے نا۔ لیکن میرے بہت بہادر بیٹے! جب ہیلی کاپٹر آئے گا تو آپ گھبرا نہ جانا۔ ہوں؟ بچہ بولا 'ٹھیک ہے پپا آپ نے مجھے تو بتا دیا، میری خیر ہے مگر مما کو بھی بتا دیجئے گا۔ وہ حاملہ ہیں کہیں ڈر نہ جائیں'۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے ہر دو قدم کے بعد ایک نیا لطیفہ کیوں سوجھتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھیں تو آپ پہ شاید پہلی بار یہ انکشاف ہو کہ ہر لطیفہ دراصل ایک چھوٹی سی ٹریجڈی ہوتا ہے۔

رومانی کہانیوں کے بعد ہمارے ذرائع ابلاغ خصوصاً فلم انڈسٹری اور جاسوسی ناولوں کے پاس ایک ہی موضوع رہ جاتا ہے۔ مار دھاڑ، یہی وجہ ہے کہ تفریح کے وقفے میں سکول کے دو چار طالب علم ٹانگوں کے زخم لئے آ پہنچتے ہیں کہ ساتھی ہم جماعت نے ایتابھ بچن کے اسٹائل میں ٹانگ ماری ہے۔ اسلحہ کی نمائش اس طرح کی جاتی ہے کہ بچوں کی دلچسپی کھلونوں سے زیادہ رائفلوں، پستولوں میں بڑھ گئی ہے۔ پچھلے دنوں کی بات ہے ایک کزن کو لے کر بیوٹی پارلر گئی جس کی انچارج کا ننھا عزیز اسے کام نہ کرنے دے رہا تھا۔ ناچار بچے کی ماں کو بلایا گیا۔ ماں نے بہلانے کے سو جتن کئے مگر بچہ قابو نہ آیا۔ آخر وہ بولی، آؤ بیٹے ٹی وی دیکھیں، بچے نے دھیان نہ دیا، بیٹے کارٹون فلم ہے، بچہ بے نیاز رہا۔ بیٹا! اس نے کلاشنکوف بھی پکڑی ہوئی ہے، بچہ جھٹ متوجہ ہو کر ماں کی بانہوں میں چلا گیا۔ اگر یہی بچہ بڑا ہو کر خود اپنے ہاتھ میں کلاشنکوف لے لے تو حیرت کیسی،

رہ گئے تعلیمی ادارے تو بیشتر پرائیویٹ تعلیمی ادارے کاروبار بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کے مالکان کو صرف پیسے کی ہوس ہوتی ہے کہ وہ آتا رہے۔ سو استاد چاہے لائق ہو یا نالائق، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، فقط یہ کوشش ہوتی ہے کہ کم سے کم تنخواہ پر آمادہ ہو جائے۔ اب اتنی کم تنخواہ پہ کوئی کوالیفائڈ صاحب یا صاحبہ تو آتی نہیں۔ بی اے، ایف اے اَن ٹرینڈ لوگ چلے آتے ہیں اور ان کی اکثریت بھی محض وقت گزاری چاہتی ہے اور جب استاد ہی محض وقت گزارنے یا دل بہلانے مدرسے آئے تو وہ تعلیم کیا دے گا؟ حال گورنمنٹ کے تعلیمی اداروں کا بھی مختلف نہیں۔ اس لئے کہ مدرس اب اپنا مقصد بدل چکے ہیں۔ تدریس مشن نہیں پیشہ بن چکی ہے۔ اساتذہ کے پیش نظر تعلیم دینا نہیں بلکہ تنخواہ لینا ہوتا ہے لہٰذا کالج ہو یا سکول اساتذہ کی اکثریت کی خواہش ہوتی ہے، جماعت میں جیسے تیسے وقت گزرے اور طلبا سیکنڈ ٹائم ٹیوشنز ضرور رکھیں تاکہ وہ اس طور مزید رقم کما سکیں۔

قارئین! جس قوم میں تعلیم دینے والے اور تعلیمی ادارے محض روپیہ کمانے کی غرض لئے ہوئے ہوں، اس قوم کی تعلیمی حالت کیا ہوگی؟ ہر باشعور آدمی بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ باقی رہ گیا نصاب، کورس تو

اس کا حال ہم سب کے سامنے ہے۔ اس مملکتِ خداداد میں چودہ سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب اس اسلامی مملکت نے مجھے بی اے کی ڈگری عطا کی اور ہم گریجوایٹ کہلائے تو ہمیں قرآن وحدیث تو دور کی بات نماز بھی ترجمہ کے ساتھ نہ آتی تھی۔ البتہ میر و غالب کی بیسیوں غزلیں نوکِ زبان تھیں۔ ہمیں یہ تو پتہ تھا کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں لیکن یہ نہ جانتے تھے کہ اللہ کا رسول کیا ہوتا ہے؟ ہم کرنل محمد خاں، رحیم گل، مستنصر حسین تارڑ، الطاف فاطمہ اور مسعود مفتی کو تو بڑے شوق سے پڑھتے لیکن 'ہمارے رسول' کو فقط بوسہ دیا کرتے۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں حساب اور انگریزی کے لئے تو کسی ڈھنگ کے استاد کے لئے تگ و دو کر ہی لی جاتی ہے لیکن دینیات مدرسے کے مڈل فیل قاری صاحب کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ ہماری مسجدوں میں مولوی صاحبان ہمسائے مولوی کو باقاعدہ مائیک پہ فصیح و بلیغ گالیاں تو دے سکتے ہیں لیکن قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی تشریح نہیں کر پاتے۔ وہ اس مسئلہ میں تو بڑی دلچسپی لیتے ہیں کہ یا رسول اللہ کہنا چاہیئے یا نہیں لیکن فقط رسول اللہ کی تشریح کرنا شاید ان کے بس کا روگ نہیں۔

محترم قارئین! اس لمبی چوڑی تحریر سے میرا مقصد آپ کو کردہ و ناکردہ گناہ یاد دلا کر ملامت کرنا ہرگز نہیں اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا کہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ یہ سب کہنے سے میری مراد فقط یہ تھی کہ آیئے دیکھیں، اگر ہم استاد ہیں تو ہم نے اپنے طالب علموں کو کیا دیا ہے؟ اگر والدین ہیں تو اولاد کے دنیاوی آرام و آسائش کے ساتھ ان کی آخرت کے آرام و آسائش کا بھی خیال رکھا ہے؟ ہم جس عہدے پہ بھی فائز ہیں، ہمارے پاس جتنے بھی اختیارات ہیں، جتنے بھی فرائض ہیں، ہم انہیں کس طرح انجام دے رہے ہیں؟ کیا ہم نے اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ انصاف کیا ہے؟ اگر ہم اسی ڈگر پر، اسی طرز اور اسی طور زندگی گزارتے رہے تو آنے والے سال ہمارے دامنوں میں کیا بھریں گے؟ ہماری قوم کا مستقبل کیا ہوگا؟ ہماری آئندہ نسلوں کا کیا ہوگا؟ اور کیا آئندہ لکھی جانے والی تاریخ میں معاف کر دے گی؟؟؟

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

- علم حاصل کرو۔ خواہ تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔
- ہمسایوں سے اچھا سلوک کرو۔
- شرک سے بچے رہو۔

احتیاط

(سیماب اولیسی)

نہ جانے کیوں دل بہت اداس ہے اور کوئی نہیں جس کے بازو پہ سر رکھ کے رو سکوں۔ شاید یہ اداسی آنکھوں کی راہ بہہ جائے مگر ایسا ہمدم کہاں سے لاؤں۔

نماز سے فارغ ہوا تو ایک طویل دن سامنے ہے جس میں جد و جہد نشیب و فراز کچے پکے راستے مصروفیات سب کچھ ہے اور جس کا اختتام خصوصی ملاقاتوں یا ملاقات کے خواہاں احباب کے مطالبات پہ ہے — مگر اس میں کیا ہوگا لوگ ملیں گے مقصد کے لیے کم اور مطلب کے لیے زیادہ اپنا اپنا درد کہیں گے۔ اس کا مداوا چاہیں گے۔ اپنے دکھ بیان کریں گے۔ دل کا بوجھ بانٹنے کے لیے اپنی تکالیف کا رونا اپنی مصیبتوں کا ذکر۔ اپنی خواہشوں آرزوؤں کو دل میں دبائے۔ اپنی چاہتوں کو مختلف الفاظ کی پڑیوں میں لپیٹ کر بغیر یہ دیکھے کہ دنیا میں اور کتنے لوگ دکھی ہیں۔ کتنی آرزوئیں ہیں جن کی قسمت پر غبار سا چھا رہا ہے — مگر لوگ انہیں سینے میں پال رہے ہیں کتنی خواہشیں ہیں جن کی تکمیل غیر یقینی ہے۔ مگر ان کو چھوڑنا بھی تو آسان نہیں۔ کتنے ارمانوں کا خون لوگوں کے حلق میں پھنسا ہوا ہے، نگل نہیں سکتے کہ آخر خون سے تھوک نہیں سکتے کہ خون تھوکنا بھی تو آسان کام نہیں — ان سب باتوں سے بیگانہ رہ کر لوگ اپنی اپنی دھن میں اپنی بات کہتے ہیں اور کہتے چلے جاتے ہیں۔ یوں پیاسے نظر آتے ہیں جیسے زندگی میں انہیں کوئی نہیں ملا جس سے دردِ دل کہتے۔ چلو کوئی بات نہیں ان کو تو سن لو کہ انہیں قرار آئے۔ دل دکھتا ہے تو دکھنے دو مگر ان کے غموں سے کچھ بوجھ تو ہلکا ہوگا کسی کو زندگی کا سکون نہ سہی ایک مسکراہٹ تو پا لینے دو — ہاں میں ان کی

باتیں ضرور سنوں گا نہ صرف سنوں گا کوئی نہ کوئی تدبیر کوئی علاج کوئی حل بتاؤں گا اور اللہ جلّ شانہٗ کتنا کریم ہے اس کی شان نرالی ہے بس اتنی بات پہ ان کا درد ختم کر دیتا ہے یا پھر قوتِ برداشت عطا فرما کر سکون و اطمینان سے نوازتا ہے۔

مگر کوئی ایسا بھی آئے گا جو میرا درد سنے میرا دُکھ بانٹے مجھے دلاسہ دے — کوئی دعا کوئی دوا کوئی علاج بتا دے جس سے کم از کم دل تو بہلا سکوں — اس کی ڈوری ہی ہاتھ آجائے اُمید بندھ جائے — مگر نہیں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا — کوئی بھی تو نہیں — پتہ ہے کیا کہتے ہیں یہ اللہ کا بندہ ہے — بہت مقرب ہے نیک ہے۔ اس کا دل روشن ہے — بے چارے سادہ انسان — ارے تمہیں کیا خبر کہ میں کتنا گناہ گار ہوں — کس قدر بدنصیب ہوں کہ اللہ سے شرمسار ہوں — یہ تو میں جانتا ہوں کہ میرے سجدے بھی اس کی بارگاہ کے قابل نہیں — وہ تو اس کا کرم ہے کہ پھینک کر منہ پر نہیں مارتا اور اگر ایسا کرتا بھی ہے تو دوسروں پہ ظاہر نہیں کرتا — الحمد للہ کتنے حلیم کس قدر کریم اور ستار العیوب سے واسطہ ہے مگر اس کے باوجود کیا انسان رب العلمین کے قریب بھی ہو تو اس سے کھیل سکتا ہے ہنس بول سکتا ہے روٹھ اور من سکتا ہے لپٹ سکتا ہے — بولو آخر چپ کیوں ہو کیا یہ سب کچھ زندگی نہیں کیا اس کے بغیر بھی جینے کا کوئی تصور ہے ہرگز نہیں — یقیناً نہیں — تو کیا اب بھی یہی فیصلہ ہے کہ مجھے اداس نہیں ہونا چاہیئے کیا اب بھی کہہ سکو گے کہ صرف تم دُکھی ہو — دیکھو ہم ہمیشہ سے ایسے نہ تھے — اپنے بھی غم خوار تھے ہماری بھی سُنی جاتی تھی — ہمیں بھی تسلیاں دی جاتی تھیں — کوئی ہمیں بھی پیار کرتا تھا — کسی کو ہماری خاطر بھی منظور ہُوا کرتی تھی — مگر زمانہ دَر آیا — اس نے کسی کو معاف کیا ہے جو ہمیں کرتا — اس کا اپنا دستور ہے اپنے طریقے ہیں — پہلے ایک ایک کر کے آسرے چھینتا ہے — محبوب اور مربی رخصت ہو جاتے ہیں — پھر آہ بھرو تو کسی کا دل نہیں دُکھتا کہ لوگوں کے اپنے محبوب ہیں وہ ان کی فکر کریں یا تمہاری — ہاں تمہیں چاہنے والے بھی تھے — مگر کیا تم اپنے ہاتھوں دفن نہیں کر چکے — اب رؤ گے تو کوئی آنسو پونچھنے نہیں آئے گا — تڑپو گے تو کوئی نہیں لپٹائے گا — وہ جن سے تمہیں سب کچھ ملتا تھا چلے گئے۔

ہاں چلے گئے ۔ دُور بہت دُور ۔ نہ صرف منوں مٹی کے نیچے بلکہ عالم کی حدود عبور کر گئے ۔ اب دوسرے عالم میں ہیں ۔ تو پھر اب کیا ہو گا ۔ اس کا کیا علاج ، کوئی حل ہے کوئی راستہ ہے بھی کہ نہیں ہونا ضرور چاہیئے ۔ ہاں ہے اور صرف ایک ہے کہ ان کا نقشِ کفِ پا مت چھوڑو ۔ ان کی راہ اپنا لو ۔ کبھی تو ان سے جا ملو گے ۔ ان سے جو تمہارے اپنے تھے جو تمہارے محبوب بھی تھے اور چاہنے والے بھی ۔ ان تک ضرور پہنچو کہ وہ سب ایک ایسے مربی کے پاس گئے ہیں ۔ ایسے غمگسار ایسے محبوب کے پاس گئے ہیں جو ساری انسانیت کا درد سُنتا ہے ۔ سب کا دُکھ بانٹتا ہے ۔ اور اپنا درد صرف اللہ کو سُناتا ہے ۔ اسے کسی سے کوئی غرض نہیں سب کو دیتا ہے مگر لیتا صرف اللہ جی سے ہے ۔ ہاں ہمت کرو اور پھونک پھونک کر قدم رکھو دیکھنا کہیں راستہ کھو نہ دینا ورنہ لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو جاؤ گے ۔ اپنوں سے ، چاہنے والوں سے ، چاہے جانے والوں سے اور یاد رکھو سب خطائیں معاف ہو جائیں گی مگر یہ خطا تمہارا راستہ بدل دے گی ۔ جُدا کر دے گی ۔ اور دیکھنا کہیں ہمیشہ کی جدائی میں نہ پڑ جانا ۔

احتیاط ، احتیاط ، احتیاط ۔

●●

داخلہ صفارہ اکادمی دارالعرفان منارہ

آٹھویں جماعت میں داخلہ ۸۸-۴-۶ سے ۸۸-۴-۸ تک ہو گا ۔ داخلہ کے متمنی طالب علم اپنے سرپرستوں کے ہمراہ ۵ ر اپریل ۸۸ء شام تک منارہ میں تشریف لے آویں ۔ ساتویں پاس کا سرٹیفکیٹ اور تین عدد فوٹو ہمراہ لاویں ۔

یاد رہے کہ داخلہ صرف آٹھویں جماعت میں ہو گا اور یہ داخلے کی آخری تاریخ شمار ہو گی

(ناظم اکیڈمی)

افہام و تفہیم

حضرت مولانا محمد اکرم مدظلہ العالی

بھئی لک صاحب۔ خوب رہی۔ عرصہ بعد چٹھی بھیجی اور وہ بھی ایسی کہ زلفِ یار سے بھی پیچیدہ تھی۔ میں نے یہ مضمون اخبار میں دیکھا تھا پڑھا نہیں تھا کہ میں شاید ایسی بحثوں میں پڑنے کی اہلیت نہیں رکھتا اور نہ فرصت مگر آپ نے بھیج دیا تو سارا حرفاً حرفاً پڑھا۔ فاضل مقالہ نگار کی علمی حیثیت اور جرأت اظہار کا معترف ہوں مگر مندرجات سے نہ پورا متفق ہوں اور نہ کلی طور پر مخالف۔

چونکہ میں بحث میں پڑنا نہیں چاہتا اور نہ آپ نے اس کی دعوت دی ہے سو اپنے تاثرات عرض کر رہا ہوں میرے خیال میں فاضل مقالہ نگار تین باتوں کے متمنی ہیں۔

۱۔ کتاب اللہ کے ارشادات کے اندر رہ کر حالاتِ حاضرہ کے مطابق معانی و مفاہیم کا اظہار ہو۔

۲۔ فقہی احکام کو حالات و واقعات جدیدہ کے مطابق انہیں حدود کے اندر حل کیا جائے اور پرانے فقہی ذخیرہ پر ہی نہ چھوڑ دیا جائے۔

۳۔ عورت کو اس کا درست مقام دیا جائے۔ یہ تینوں باتیں درست نہیں جبکہ مندرجہ ذیل ایک اور صرف ایک اصول کو نہ توڑا جائے اور اس کی حدود سے تجاوز نہ ہو اور وہ اصول یہ ہے۔

۱۔ قرآن فرد واحد کی ارشاد فرمائی ہوئی بات ہے جو اسے اللہ سے وصول کرنے میں اکیلا ہے حتیٰ کہ کوئی ایسا گواہ نہیں رکھتا جو نزول آیات کے وقت ساتھ ساتھ سن رہا ہو۔

۲۔ وہ شخص اتنا سچا اتنا دیانتدار اور اتنا امین ہے کہ پوری مسلمان دنیا میں ہے۔ اب تک اس کی اس بات پر مکمل یقین کیے ہوئے ہے اور اس یقین میں ادنیٰ شبہ بھی حلقہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔

۳۔ اس ہستی کی نبوت دائمی اور ابدی ہے اور بعثت سے لے کر قیام قیامت تک اسی کا اتباع کیا جائے گا۔

۴۔ اس کا فرض منصبی صرف قرآن پہنچانا ہی نہیں بلکہ فرائض نبوت چار ہیں۔ تلاوت آیات۔ تزکیہ۔ تعلیم کتاب تعلیم حکمت دوسری جگہ ارشاد ہے

۔یعنی آپ لوگوں پر بیان کریں کہ ان کی طرف کیا نازل ہوا مقصد قرآن کے معانی سے ہے تبیین کے

معنی ہیں کھول کر وضاحت سے بیان کرنا اگر ایسا نہ ہوتا تو عرب کے فاضل ہر آیات سے اپنی مرضی کا مفہوم اخذ کر لیتے کہ عربی ہیلے لمعانی زبان ہے اور ایک ایک لفظ کے بعض اوقات سینکڑوں معانی بن جاتے ہیں۔ اب آیئے کہ وہ اصول نکھر کر سامنے آگیا کہ کتاب اللہ کے جو معانی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائے ہیں ان کے اندر رہتے ہوئے ہمیں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کا حق حاصل ہے اور یہ درست ہے رہی بات متقدمین فقہا کی تو انہیں بیک جنبش قلم شاہوں کی خواہشات کا آلہ کار قرار دینا آسان کام نہیں ان میں ایک ایک متعدد مطلق العنان حکمرانوں سے برسرِ پیکار رہا اور ایسے مظالم برداشت کیئے جو ان ہی کی ہمت تھی مگر نا جائز کو جائز کہہ کر نہ دیا۔

نیز تمام فقہی مکاتب فکر میں صرف فتوے یا فیصلے نہیں ہر فتوے کے پیچھے مکمل دلائل موجود ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم بھی کتاب اللہ کی اس تفسیر و تشریح سے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی دلائل جمع کریں پھر ان کو دلائل سے مقابلہ کر کے اگر ہمارے دلائل وزنی ہوں تو اطاعت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ضروری ہے نہ فقہا کی بیشک انہیں چھوڑ دیا جائے لیکن اگر اس معاملہ میں وہ ہم سے بازی لے چکے تو پھر تحصیل حاصل سے فائدہ؟ پھر تو صرف جرأت اقرار چاہیئے۔ رہا معاملہ مسلمان بادشاہوں کا تو حسب الارشادِ حدیث پاک ان میں نیک بھی تھے اور بدکار بھی۔ لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ کافر اور غیر مسلم بادشاہوں کے مظالم اور عیاشی کے مقابلہ میں مسلمان بدکار بادشاہ بھی فرشتہ نظر آتا ہے کاش ہم اس نظر سے بھی دیکھیں ہم جو شکایت رکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ انہیں مسلمان ہونے کے ناطے برائی نہیں کرنا چاہیئے تھی ورنہ تو آپ بادشاہوں کو جانتے ہی ہیں۔ خواہ وہ ہندو راجے رہے ہوں یا سکھ آریائی ہوں یا وسط ایشیائی یوروپین ہوں یا افریقی ذرا اک نظر ادھر بھی۔

۳ – تیسری بات عورت کا مقام اسلام کی نگاہ میں اسمیں میری ناقص رائے میں راویتی ملا اور جدید مہذب مسلمان دونوں زیادتی یعنی افراط و تفریط کے مرتکب نہیں نہ اس قدر تنگی ہے جو ملا کا تصور اور نہ اسقدر آزادی کہ جہاں اس آنکھیں سینکا کرے اور سربازار اسے نچایا جائے یا بے پردہ ٹرک کی چھت پر کھڑا کر کے جلوس نکالا جائے۔

عہد نبوی میں عورتوں کے پردہ کا حکم دیا گیا جس کا مقصد مرد و زن کو ایک دوسرے کی نگاہوں سے محفوظ رکھنا تھا اور جدید ترین سائنس نے یہ عقدہ حل کیا ہے کہ مرد اور عورت کے اندر ایک خاص غدود ہوتا ہے۔ جب بھی دو مخالف جنس کے افراد کے غدود ایک جیسے ہوں ان کی نگاہیں چار ہوں تو جذبات میں انگیخت پیدا ہو جاتی ہے یہ بالکل نئی تحقیق ہے اور اسلام نے انسان کو اس دلدل میں گرنے سے پہلے خبردار کر دیا اور بچ کر چلنے کا حکم دیا ہے علاوہ ازیں احد سے قادسیہ تک عورتیں میدان کارزار میں بھی نظر آتی تھیں نہ صرف پانی پلاتی یا مرہم پٹی کرتی ہوئی بلکہ بوقت ضرورت تلوار چلاتی ہوئی مگر بے حجابانہ اختلاط کہیں نظر نہیں آتا اور نہ اس میں جری اور تلوار کی دھنی بیبیوں کو کہیں سالار بنا کر بھیجا جاتا ہے رہی بات دیار مغرب کی حکمران عورتوں کی تو مغرب کا ہی ایک مفکر کہتا ہے "عورت باہر آکر ہر وہ کام کر سکتی ہے جو مرد کرتا ہے مگر وہ عورت نہیں رہتی"

(باقی صفحہ آخر پر)

عورت کی عظمت

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ
لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۔ (۴:۳۴)

ہر خوبی یا اوصافِ عالیہ کے مختلف مدارج ہوتے ہیں ۔ اور یوں تو ہر درجہ مستحسن اور محبوب ہوتا ہے مگر انسان کی فطرت یہ ہے کہ اسے ہمیشہ خوب تر کی تلاش اور خواہش ہوتی ہے بلکہ جی چاہتا ہے کہ ہر خوبی اور کمال کا انتہائی بلند درجہ حاصل ہو جائے ۔ اور سچ پوچھیے کہ انسان کی ساری تگ و دو تمام جہد مسلسل اسی کمال کے حصول کے لیے ہوتی ہے ۔ میدانِ عمل گو مختلف ہوتے ہیں مقاصد اور نصب العین جدا ہوتے ہیں مگر ان میں یہ قدر مشترک لازماً موجود ہوتی ہے کہ جو خوبی اور کمال ہو معیاری اور مثالی ہو۔

علم سے بے بہرہ اور تہذیب سے ناآشنا ایک دیہاتی کو دیکھیے وہ اگر زمیندار ہے تو اس میں اسے نام پیدا کرنے کی خواہش ہے اور چاہتا ہے کہ بہترین زمیندار سمجھا جاؤں صنعتکار ہے تو مثالی کاری گر بننے کی خواہش ہے ۔ پڑھا لکھا مہذب شہری ہے تو اسے اپنے فن اور اپنے کام میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے کی دھن ہے ۔ سیاسی ذہن کا ہے تو نمائندگی اور اقتدار کے اعلیٰ منصب پر اس کی نگاہ جمی ہوئی ہے ۔ اس سے یہ حقیقت ظاہر ہے کہ یہ گویا انسانی فطرت کا بنیادی مسئلہ ہے ۔

اسلام دینِ فطرت ہے اس کے سارے احکام اس کی تمام تعلیمات اس کے

جملہ قوانین و ضوابط انسانی فطرت کے عین مطابق ہی نہیں بلکہ انسانی ضرورت کو پورا کرنے کی واحد صورت ہے۔

اسی داعیہ یعنی خوب تر کی تلاش کو لیجئے۔ اور اس کے ساتھ انسان کی اس فطری خصوصیت کو شامل کیجئے کہ وہ مدنی بالطبع واقع ہوا ہے۔ یعنی مل جل کے زندگی بسر کرنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اسی خصوصیت کا کرشمہ ہے کہ اس کی وجہ سے عائلی زندگی کی بنیاد پڑتی ہے اور یہی ترقی کرکے اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی صورت اختیار کرتی ہے۔

ایک گھر یا کنبہ کی بنیادی اکائی وہ رشتہ ہے جو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان خاوند اور بیوی کے عنوان سے قائم ہوتا ہے۔ مرد کی فطرت میں فعالیت ہے اور عورت میں انفعالیت — لہٰذا فطری کہ مرد کو ایک معیاری اور مثالی رفیقِ حیات کی تلاش ہوتی ہے تو انسان کے اس فطری داعیہ کی تسکین اور تکمیل کے لیے اسلام نے جہاں مرد کو اس معیار سے آشنا کیا جو اس کو معیاری رفیق کی تلاش میں رہنمائی کرے اور عورت کو ان خوبیوں سے روشناس کرایا جو اس کی عظمت اور رفعت کی آئینہ دار ہیں۔

اِس سلسلے میں اسلام نے اصولی تعلیم دیتے ہوئے سب سے پہلے یہ بتایا کہ ایک گھر یا کنبہ کے نظام کو صحیح طور پر چلانے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایک فرد ذمہ دار نگران اور محافظ مقرر ہو۔ باقی افراد اس کی رہنمائی میں امن و سکون سے ترقی کی راہ پر گامزن رہیں۔ یہ ایسی ضرورت ہے جس سے کوئی انسان واقف نہیں۔ کوئی مدرسہ ہو کالج ہو فیکٹری ہو ادارہ ہو۔ جب تک کوئی ایک فرد اس کا نگران اور ذمہ دار مقرر نہ کیا جائے کوئی کام نہیں چل سکتا۔ اور صرف نگران ہی مقرر کرنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ یہ دیکھنا لازمی ہوتا ہے کہ جو کام اسے سونپا جا رہا ہے، کیا اس میں اس کی صلاحیت بھی ہے اور جب ایسی صورت سامنے آئے کہ ایک سے زیادہ باصلاحیت افراد موجود ہوں تو فیصلہ کرتے وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان میں نسبتاً سب سے بہتر کون ہے۔

قرآن مجید کی جس آیت کا ایک حصّہ اوپر نقل کیا گیا ہے اس کی ابتدا اسی اصول کے بیان سے ہوتی ہے کہ جب ایک

مرد اور ایک عورت کے درمیان خاوند اور بیوی کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ ایک خاندان کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ اِس لیے اس سلسلے میں انسان کی پہلی اور بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بتا دیا کہ اس ادارے کا نگران اور محافظ مرد ہوگا۔ کیونکہ خالقِ کائنات نے تخلیقی طور پر اس میں قیادت و نگرانی اور حفاظت کی صلاحیت رکھ دی ہے اور بیرونی ماحول کے تقاضوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری اسی پر ہے۔ عورت کو خارجی حالات اور معاشی فکر سے آزاد قرار دے کر اس کی ساری توجہ اور تگ و دو کا رخ گھر کے اندر کی تعمیر و تزئین اور اصلاح کی طرف کر دیا اور اس کے ذمہ یہ فریضہ رکھا کہ گھر کے نگران اور محافظ کی نگرانی اور رہنمائی میں تعمیرِ انسانیت کا فریضہ ادا کرتی رہے۔ عورت کے فرائض میں بقائے نوع اور اصلاح و تربیت اولاد کو سرِ فہرست رکھ دیا۔ یہ کام بظاہر معمولی نظر آتا ہے مگر اتنا کٹھن ایسا ایسا وقت طلب اور دقت طلب ہے کہ عورت اس کے علاوہ کسی اور بوجھ کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ان فرائض کی کماحقہٗ بجا آوری کے لیے جن اوصاف اور جن خوبیوں کی ضرورت ہے اس کی نشاندہی کر دی اور فرمایا کہ:

(۱) صالح عورت وہ ہے جو نگرانِ کار کی ہدایت اور رہنمائی میں یہ تعمیری منصوبہ پورا کرنے کا جذبہ رکھتی ہے۔ جس کا نام قرآن نے "قانتات" رکھا ہے۔ یہاں دو باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ اوّل یہ کہ صالح کے معنی نیک کے کیے جاتے ہیں۔ مگر اس نیک کے لفظ کے مفہوم میں جو وسعت ہے، اس پر نگاہ نہیں رکھی جاتی۔

نیک وہ ہے جو صحیح کام صحیح صورت میں صحیح طریقے سے صحیح وقت پر کرے۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں کام کرنے کی صلاحیت بھی کہتے ہیں۔ گویا "صالحات" کے لفظ سے یہ ظاہر ہے کہ یہاں معیاری عورت کی پہلی صفت یہ بتائی کہ اس میں عورت کے فرائض ادا کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہو۔ مگر یہ صلاحیت تو قدرت کا عطیہ ہے اور تخلیقی امانت ہے یعنی غیر اختیاری فعل ہے اس لیے عورت پر اس کی ذمہ داری کیوں ڈالی گئی۔ تو یہاں یہ مفہوم ظاہر ہوتا ہے کہ خالق نے اسے عورت بنا کر اس میں صلاحیت تو رکھ دی ہے۔ اب اس صلاحیت کو بروئے کار لانا عورت کے ارادہ اور جذبہ پر منحصر ہے۔ تو اس کا مفہوم یہ نکلا کہ معیاری عورت وہ ہے

جو خداداد صلاحیتوں کو اپنے ارادہ و پسند سے بروئے کار لاکر نگرانِ کار کی ہدایت کے مطابق انسانیت کی تعمیر اور ترقی میں کوشاں ہو۔ اگر یہ نہیں تو وہ عورت نہیں بلکہ عورت کی شکل میں ایک بے نام مخلوق ہے۔

دوسرا لفظ "قانتات" ہے اسے باطل قوتوں اور اسلام دشمن اقوام اور تحریکوں نے خوب ایکسپلائٹ کیا ہے۔ اس کا مفہوم ہے "اطاعت شعار" اسلامی معاشرے کو بگاڑنے اور اسلام کو بدنام کرنے کے لیے مغرب نے عورت کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لیے یہ پڑھایا کہ اسلام نے تو عورت کو مرد کا غلام نوکر اور بندۂ بے دام کی حیثیت دی ہے۔ حالانکہ یہ ہر طرح مرد کے برابر ہے۔ اس لیے "آزادیٔ نسواں" اور "مساوات مرد و زن" کے پُرفریب نعروں اور عنوانوں کے ساتھ اسلام کے خلاف تحریکیں چلادیں اور عورت بھی ایسی بھولی بھالی مخلوق ہے کہ وہ باطل کے دامِ ہمرنگ زمین میں پھنس گئی اور ایسی پھنسی کہ خود اس کے جال حلقوں کو تنگ کرتی جارہی ہے اور اپنے مقصدِ تخلیق سے ہٹ کر بے راہ رو ہو رہی ہے اور ستم بالائے ستم یہ فطرت کے خلاف بغاوت کو اپنی خوبی سمجھتی ہے۔ واقعی باطل کی چال ایسی کامیاب ہوئی کہ حد کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری کی کیفیت پیدا ہوگئی۔

اِس اطاعت شعاری کے مفہوم اور اس کے تقاضوں پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو باطل کا سارا استدلال رد ہوا جاتا ہے مگر یہ تو جب ہو کہ کوئی غور کرنے پر آمادہ بھی ہو۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ فرض کیجیے ایک کالج ہے پرنسپل اس کا نگران اور ذمہ دار ہے۔ تو کیا کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ کالج کے تمام پروفیسر اور طلبہ پرنسپل کے غلام اور نوکر ہیں۔ حالانکہ سب پر اس کی اطاعت تو فرض ہے۔ اسی طرح ایک مملکت کے وزیرِ اعظم کو لیجیے وہ سربراہِ مملکت نگران اور ذمہ دار ہے تو کیا سارے وزراء اور حکومت کے دوسرے کارندے وزیرِ اعظم کے غلام اور بندۂ بے دام ہوتے ہیں۔ حالانکہ سب کے لیے اس کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔ وہاں یہ قانون کیوں لاگو نہیں ہوتا سب وزیروں اور حکومت کی تمام مشینری کو مساوات اور آزادی کے نام سے وزیرِ اعظم کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیوں نہیں کیا جاتا۔ اس لیے سب

جانتے ہیں کہ یہاں پرنسپل یا وزیرِاعظم کی ذات کی اطاعت مطلوب نہیں بلکہ حکومت کے دستور، قانون اور قواعد و ضوابط کی اطاعت ہوتی بھی ہے اور کرائی بھی جاتی ہے۔ وزیرِاعظم کی حقیقت اس کے بغیر کچھ نہیں کہ مملکت کے دستور اور قانون کی پابندی کرانے کی ایک ایجنسی ہے۔ بعینہٖ یہی حال عورت کے لیے مرد کی اطاعت کرنے کا ہے بلکہ اسلام نے تو یہ بنیادی اصول سکھایا ہے کہ

لا طاعۃ المخلوق فی معصیۃ الخالق

یعنی جہاں خالق کے احکام کی خلاف ورزی ہو وہاں مخلوق کی اطاعت کرنا ہی گناہ ہے۔ تو عورت کے لیے مرد کی اطاعت کا مفہوم اس کے بغیر اور کیا ہے کہ یہ دراصل اللہ کی اطاعت ہے۔ جو مرد کے ذریعے عورت سے کرائی جاتی ہے۔ کیونکہ اس سٹیٹ میں مرد ہی اللہ کے قانون کی نمائندگی پر مامور ہے۔ اس لیے جب عورت کو مرد کے خلاف اُبھارا جائے گا تو اصل مقصد یہ ہے کہ عورت کو اللہ و رسول کے خلاف بغاوت پر اُبھارا جائے۔ چنانچہ یہ ہو کے رہا ــــ ماضی قریب میں اسلام بیزار "مسلمان" خواتین نے جو احتجاجی جلوس نکالا تھا اس میں مطالبہ یہی تو تھا۔ رسولؐ کا حکم نامنظور، اللہ کا قانون نامنظور، قرآن کا حکم نامنظور ــ یہ وہ مقام ہے جہاں باطل نے "مساوات" کے راستے سے عورت کو پہنچا دیا ہے ـ تو قانتات کا مفہوم یہی تو ہے کہ مثالی عورت وہ ہے جو اللہ اور رسول کی اطاعت کو شیوہ بنائے ـ اور گھر کے نگران کی رہنمائی میں اس اطاعت میں غفلت اور کوتاہی نہ آنے دے ـ ظاہر ہے کہ اس میں مرد کی غلامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ دوسری صورت میں اللہ و رسولؐ کے خلاف بغاوت کا ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی سپاہی یا افسر، جرنیل کی اطاعت کرنے سے انکار کر دے تو اسے حکومت کا باغی تصور کیا جاتا ہے ـ وجہ ظاہر ہے کہ جرنیل اس سے اپنی اطاعت نہیں کرا رہا بلکہ حکومت کے قانون کی اطاعت کراتا ہے جس حکومت کا وہ نمائندہ اور نگران مقرر ہوتا ہے۔

مثالی عورت کی دوسری صفت اور خوبی بتائی کہ حافظات للغیب یعنی وہ حفاظت کرنے والی ہے ـ حفاظت کا تعلق ان چیزوں سے ہوتا ہے جو قیمتی ہوں ـ اہمیت کی حامل ہوں اور محبوب ہوں اور انسان کے پاس بلا امتیاز تین چیزیں اس نوعیت کی پائی جاتی ہیں ــ

عزت و آبرو، مال و دولت اور اولاد کی اہمیت کے اعتبار سے ان میں فرق مراتب ہے۔ یعنی ایک کی حفاظت کے لیے دوسری کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ ان تینوں کا تعلق جہاں ایک طرف عورت کی ذات سے ہے وہاں دوسری طرف خاوند سے، کنبہ برادری سے اور معاشرے سے بھی ہے۔ ان تین کے علاوہ ایک چیز ایسی ہے، جس کا زیادہ تر تعلق اپنی ذات سے ہے اور وہ ہے اپنی جان کی حفاظت — ان میں سے ہر ایک کی حفاظت کے انداز مختلف ہیں مثلاً عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے اپنی ذات پر ہی نظر نہیں جاتی بلکہ خاندان، قوم اور نوع انسانیت پر بھی نگاہ رہتی ہے اور مسلمان عورت کے لیے عزت و آبرو وہ ہوتا ہے جو اسلام نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔ اس معیار میں کئی امور پیش نظر رہتے ہیں مثلاً تمدنی معاملات میں یہ دیکھنا کہ اپنا ہے یا پرایا ہے۔ محرم ہے یا نامحرم ہے، اجنبی ہے یا شناسا ہے، دوست ہے یا دشمن ہے۔ ان تمام کے لیے اسلام نے جو حدود مقرر کر دی ہیں ان کا خیال رکھنا عزت و آبرو کی حفاظت کرنا ہے۔ اسی طرح مال و دولت کی حفاظت کا بھی سلیقہ ہے۔ مثلاً سب سے پہلے یہ دیکھنا کہ مال ذاتی ملکیت ہے یا خاوند کا ہے۔ اور میں اس کی امین ہوں۔ اگر اپنا ہے تو اس کے استعمال میں مجھے کامل آزادی ہے یا پابندی بھی ہے۔ اگر اسلام نے اس سلسلے میں کوئی پابندی عائد کی ہے تو اسے خوشی سے قبول کرنا۔ اور اس کے مطابق اس سے کام لینا ذاتی مال کی حفاظت ہے۔ اور اگر خاوند کا مال ہے، تو امین کی حیثیت سے مالک کی ہدایات کے مطابق اس میں تصرف کرنا مال کی حفاظت کہلائے گا۔ اور اولاد کی حفاظت بڑا وسیع میدان ہے — نہایت کٹھن کام ہے۔ کیونکہ اس میں اولاد کی حفاظت، اس کی صحت، اس کی غذا وغیرہ کا صحیح اہتمام پھر اس کی تربیت، تعلیم، اخلاق، عادات کی حفاظت جان جوکھوں کا کام ہے۔ یہ اتنا عظیم منصوبہ ہے اور ایسا ہمہ وقتی توجہ کا متقاضی ہے کہ عورت کو جان کھپانی پڑتی ہے۔ اس کے باوجود اگر اس پر کوئی اور ذمہ داری ڈالی جائے تو یہ عورت پر ظلم ہے — مگر کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ اب عورت اس ظلم کا مطالبہ کرتی ہے۔ وہ دفتر میں کلرکی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ وہ میدان میں ہاکی کھیلنے کا تقاضا کرتی ہے۔ کچہری میں وکیل بن کر معاشی

طور پر آزاد ہونا چاہتی ہے۔ یہ تو درست ہے کہ جو وہ چاہتی ہے وہ اسے مل ہی جائے گا مگر وہ عورت نہیں رہے گی اور اپنے گھر کو ویران بنا دے گی۔ اور حفاظت کے یہ تینوں خانے خراب کر کے چھوڑے گی۔ اور وہ مرد مؤنث کسی صورت میں بھی مثالی اور معیاری عورت قرار نہیں دی جا سکتی۔

یہاں حفاظت کے ساتھ ایک اور لفظ کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور وہ ہے للغیب کا۔ اس نے عورت کی عظمت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ مشاہدہ یہ ہے کہ آدمی کسی کے سامنے اس کے ساتھ جو رویہ اختیار کرتا ہے وہ اس سے مختلف ہوتا ہے جو اس کی غیر حاضری میں اختیار کیا جاتا ہے اور ایسا کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو ابن الوقت، کوتاہ بیں، ریاکار، بہروپیے اور ایکٹنگ کے عادی ہوں۔ ان کی ہر حرکت دکھاوے کی ہر ادا محض SHOW کے لیے ہوتی ہے اور یہ اداکاری دراصل انسان کی ذات کی نفی ہوتی ہے۔ انسانی سیرت میں یہ بہت بڑا عیب ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک عارف کی پیش گوئی پوری ہو گئی کہ ؎

عجب نہیں کہ رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز
کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے

چنانچہ یہ اداکاری اب خوب بن چکی ہے۔

اور تحمدہٗ و نصلی پڑھ کے اداکاروں کو میڈل اور ایوارڈ دیے جاتے ہیں مگر اسلام چاہتا ہے کہ مثالی عورت کے کردار میں اس تصنّع اور بناوٹ کو دخل نہ ہو۔ بلکہ اس میں خلوص ہو۔ ایثار ہو للّٰہیت ہو خیر خواہی کا جذبہ ہو اس تمام منظر کو اللہ کریم نے ایک لفظ "غیب" میں سمو کے رکھ دیا ہے۔ یعنی مثالی عورت وہ ہے جو خاوند کی موجودگی میں محض اسے دکھانے کے لیے حفاظت کی ایکٹنگ نہ کرے بلکہ پورے خلوص سے پوری دلسوزی سے اس کی غیر حاضری میں بھی اس کا رویہ وہی ہو جو اس کی موجودگی میں ہو سکتا ہے یہ ہے عورت کی عظمت کا نقطۂ عروج ہے۔

مثالی عورت کی یہ خوبیاں بیان کرتے کے بعد اللہ کریم نے ایک امر کا اضافہ فرمایا ہے کہ "بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ" یعنی یہ کام اتنا کٹھن ہے کہ کوئی عورت اپنی قوت و قابلیت کے بل بوتے پر اس سے یوں بتا دیا کہ عورت اگر پورے خلوص سے یہ کمال حاصل کرنا چاہیئے تو اللہ اس کی حفاظت کرے گا۔ مدد کرے گا توفیق دے گا۔ اسباب فراہم کرے گا حالات سازگار بنائے گا۔

اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جو قادرِ مطلق

ہے وہ اگر مددگار ہو تو حامی و ناصر بن جائے تو انسان کی کامیابی میں کوئی رکاوٹ کھڑی ہو سکتی ہے۔ کوئی شک باقی رہتا ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے عورت کا یہ خلوص رحمتِ الٰہی کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے مقناطیس کا کام دیتا ہے۔

بس اسلام کی نگاہ میں مثالی عورت وہ ہے جس میں یہ خوبیاں پائی جائیں اور ان خوبیوں کا ماحصل یہ ہے کہ ایسی عورت اپنی ذات کے لیے خاوند کے لیے خاندان اور کنبہ کے لیے قوم کے لیے بلکہ پوری انسانیت کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہوگی۔ اس کے اعضاء و جوارح انسانیت کی تعمیر، تہذیب، اور تزئین میں مصروف ہوں گے اور اس کے دل کا رشتہ رضائے الٰہی کے ساتھ جڑا ہوا ہوگا۔

سچ کہا عارف لاہوری نے ؎

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری!

●●

بقیہ: افہام و تفہیم

اسلام عورت سے اس کا عورت پن یا نسوانیت نہیں چھیننا چاہتا اور بس۔

اتفاق ایسا ہے کہ خود مُلّا ہوں لیکن روایتی مُلّائیت سے بیزار اور خود پیر ہوں روایتی پیری سے نہ صرف باغی بلکہ اس پر سخت تنقید کرتا ہوں۔

میری رائے میں مُلّا اور پیر میں دوسرے لوگوں کی نسبت کام کرنے کی حیرت کئی گنا زیادہ ہونی چاہیئے تب ہی تو وہ راہنما بننے کا مستحق ہے اور سب سے پہلے ضروری ہے کہ معروف ذرائع سے رزق پیدا کر سکتا ہو اور کرتا ہو کسی بھی انسان کا اس بارے میں محتاج نہ ہو اگر رزق مریدوں سے لے کر کھاتا ہے تو راہنمائی کا حق نہیں رکھتا اور اگر کوئی اتنا ہی دینی کام میں مشغول ہے کہ کاروبار کی فرصت ہی نہیں پاتا تو صرف اس قدر لینا جائز ہوگا جس پر عام شہری کا گزارہ ہو سکے عیش کرنا حرام ہے۔

اب اس ترازو میں تولیں تو قوم کا بہت سا بوجھ اتر جائے گا۔

سو ہمیں اجتہاد کا حق بھی حاصل ہے اور عورت کی قابلیت سے ذاتی اور قومی امور میں استفادہ بھی درست ہے اور مُلّائیت کی اصلاح کی ضرورت بھی۔

امید ہے فاضل مضمون نگار میری اس گستاخی کو قابلِ معافی جانتے ہوئے ناراض نہ ہوں گے۔

آپ کے سب احباب کا خادم ہوں۔